

MONTHLY

STAR

BHOPAL

ماہنامہ

افکار

بھوپال

جولائی سنہ ۱۹۴۷ء

ادارہ

رشدی ۔ صہباء

بمبئی آفس
۲۶۴، بلاسس روڈ ۔ بمبئی

دہلی آفس
فیاض گنج بہادر گڈھ روڈ، دہلی

ناگپور آفس
موہن منزل چھاؤنی ۔ ناگپور

حیدرآباد آفس
۳۰۰، رسالہ عبداللہ قدیم حیدرآباد (دکن)

زرِ سالانہ ؏ ششماہی ؏ فی پرچہ ۸؍

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

جلد ۵ **سرخیاں** شمارہ ۵

نوٹ

خاکے

:از:

صہبا لکھنوی

خاکے ۔ زندگی کے رنگا رنگ خاکے ہیں جن میں صہبا نے انوکھے اور اچھوتے انداز سے رنگ بھرا ہے ۔ !

خاکے ۔ میں آپ کو سوچ کی نئی راہیں، گرد و پیش کے حقیقت افروز نقوش اور اسلوب نگارش کی انفرادی خصوصیات ملیں گی۔!

خاکے ۔ صہبا کا تازہ مجموعۂ کلام ہے، جو عنقریب پیش کیا جائیگا!۔

آبشار

:از:

رشدی

افکار کے ایک سالہ افسانوں کا انتخاب

:لکھنے والے:

مرزا ادیب، ابراہیم جلیس، احمد ندیم، صدیقہ بیگم، وجاہت سندیلوی، نسیم سلیم چھتاری، پریم ناتھ پردیسی ناہید عالم، پرتھوی ناتھ شرما، رشدی، عاتق شاہ اور قمر جمالی ـــــ یہ وہ فن کار ہیں جن کی تخلیقات اردو ادب میں مستقل جگہ رکھتی ہیں۔ "آبشار" ان فنکاروں کے بہترین افسانوں سے ترتیب دیا گیا ہے، ہر افسانہ نئی تکنیک، منفرد اسلوب اور اچھوتے پلاٹ کا آئینہ دار ہے

یہ انتخاب

عنقریب پیش کیا جائے گا

اشاریہ

ترقی پسند ادب کی تحریک وقت کی اہم ترین آواز بن گئی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے یہ ننھا مُنا پودا کافی سرسبز ہوگیا ہے اور بادِ سموم کے جھونکے جو اس کو جھلس دینے کے لئے غضبناک ہو رہے تھے خود اپنی "آتشِ شوق" میں جل رہے ہیں۔ ترقی پسند ادب نے فکر و نظر کی ایک نئی راہ کھولدی ہے۔ پڑھنے والوں نے بھی ترقی پسندی کی حمایت کی اور زمانہ نے ادب کے حیات آفریں اور صحت مند عنصر کے حق میں فیصلہ دیا۔ جب ادب نے زمانہ کے ساتھ ساتھ کروٹ لی اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا اور مستقبل کی جھلکیاں بھی دکھائیں تو آج وہی ترقی کر رہا ہے۔ ادب اور زندگی کا تعلق بہت گہرا ہو چکا ہے، ماضی کی مرثیہ خوانی اور مستقبل کی جد و جہد سے فرار اب صرف رجعت پسندوں ہی کا مطمح نظر بنی ہوئی ہے اور وہ اپنے اس قسم کے تخیلی اور بیمار ادب کے تانے بانے میں معاشرہ کے عفونت انگیز ناسوروں کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری تحریک ہر حصۂ ملک میں اپنے مضبوط حلقے قائم کر چکی ہے اور ہندستان کے سربرآوردہ اور ممتاز فنکار اس سے وابستہ ہو چکے ہیں جن کے ترقی پسندانہ افکار تعمیری طور پر مسائلِ حیات کو سلجھانے، سماجی پستی اور افلاس کو دور کرنے کے لئے عوام کو جگا رہے ہیں۔ چند دنوں سے کچھ شکست خوردہ ذہنیت کے ادیب اپنی ناکامیوں اور حسرتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مذہب کی آڑ میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر نہایت ہی غیر شائستہ اور رکیک الزامات لگا کر اپنے دلوں کو تسکین دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے مخالفین شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مصائب سے کڑی آزمائشوں میں سے گذر کر، عوام اب اپنے اچھے بُرے کو سمجھنے لگے ہیں، اور مذہب کا نام لیکر اُنھیں فریب نہیں دیا جا سکتا۔ ادب میں مذہبیت کو غلط طور پر داخل کرکے مخالفین اپنی معصومیت کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، — لیکن کیا کیا جائے کہ عوام اب ایسے ادب کو قبول کر رہے ہیں، جو زندگی کے لئے قابلِ قدر ہو، سماج کے واسطے تعمیری صلاحیتوں کا حامل ہو اور بھوکوں ننگوں اور مفلسوں کو سہارا دے سکے — ترقی پسند ادب نے صحت مندانہ قدروں کو راہ دی ہے — اور سچی زندگی کی ترجمانی کی ہے — رنگین ترانے الاپنے والے تخیل پرستوں پر یقیناً اس وقت سکرات موت کا عالم طاری ہے اور وہ کشمکش کی حالت میں اپنے کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، — ایسے نادان مخالفین کو محسوس کر لینا چاہیے کہ وقت کے صحیح تقاضے اُبھر آئے ہیں، ہوا کا رخ بدل چکا ہے۔ زندگی اور ادب کے دھارے ایک ہی سمت بہہ رہے ہیں۔ ترقی پسندوں کا محاذ بہت مضبوط ہو چکا ہے، ان کی تنظیم مستحکم ہوگئی ہے اور وہ ایسے ادبچھے داروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے — وہ خاموشی کے ساتھ عُریاں حقائق کے روبرو، اپنے ٹھوس عمل سے تاریخی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

اب کے تین طویل افسانے اور ایک مضمون ہے۔ "چکراتے ہوئے" "بہار کے اُبھرتے ہوئے نوجوان اشتراکی فنکار انور عظیم کا شہ پارہ ہے جس میں ترقی پسندی پوری طرح نمایاں ہے۔ "بازگشت" — پروین رشدی نے کھانڈیکر کے مرہٹی ناول کا ملخص نہایت ہی شستہ اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے، جو یقیناً پسند کیا جائیگا۔ "یہ ہے ایک گلی" عاتق شاہ کا یہ کامیاب طنز آمیز نفسیاتی تجزیہ ہے۔ "ترقی پسند ادب" — ضیا عظیم آبادی نے بڑی محنت سے یہ مقالہ لکھا ہے اور ادب کے موجودہ رجحانات پر محققانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

آبگینے — پہلے کی طرح اس بار بھی بہار آفریں ہیں — جس میں آج کے زندہ شاعروں کا اچھوتا تخیل کار فرما ہے — "اشارے"۔ "سوتے جاگتے"۔ "زنان و مکاں"۔ "سماج کے سائے تلے"۔ "آج"۔ "مشورہ" اور "نیا دور" وغیرہ اس شمارے کی بہترین تخلیقات ہیں، جنھیں آپ کے پسندیدہ اور محبوب فنکاروں نے پیش کیا ہے۔

ادارہ

مدّوجزر

ہندوستان اور پاکستان

۳؍جون ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اس دن آخر کار برطانوی حکومت نے ہندوستان کو اختیارات سونپنے کا فیصلہ کر دیا۔ برطانوی اسکیم کی تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں۔ اس اسکیم کی رو سے ہندوستان اور پاکستان کی دو ڈومینینیں قائم ہوگئی ہیں اور سیاسی حالات کی روشنی میں، ہندوستان کے مستقبل کی تصویر صاف نظر آرہی ہے، ــــ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان اگرچہ اپنی اصلی حیثیت میں نہ ہی مقطوعہ شکل میں مان لیا گیا ہے ــــ کانگریس نے تقسیم بنگال اور پنجاب کا جو مطالبہ کیا تھا وہ بھی پورا ہو چکا ہے۔ بنگال اور پنجاب اب دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ صوبۂ سرحد میں برطانوی اسکیم کے مطابق استشارۂ جمہور ہو رہا ہے۔ بلوچستان میں بھی یہی صورت ہے۔ سندھ پاکستان کے حق میں اپنا فیصلہ دے چکا ہے ــــ ہندوستان کے جو لیڈر تقسیم کے سخت مخالف تھے آج انھیں اسی تقسیم سے، ہندوستان کے تعطل کے خاتمہ کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے، جہاں تک ملکی تقسیم کا تعلق ہے، یہ ہندوستانی قائدین ہی کی سیاست کا نتیجہ ہے اور اس کی پوری ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت نے بار بار ایسی اسکیمیں پیش کیں کہ باہمی مصالحت سے ہندوستان کی گتھی سلجھ جائے اور دونوں بڑے فرقے رواداری اور خلوص کے جذبہ سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ ہندوستانی سیاسی انقلاب کے آخری دور میں کانگریس نے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ مسلم لیگ کو جو خدشات تھے وہ پوری طرح ابھر آئے اور تقسیم کو قطعی بنا دیا ــــ بہر حال اب یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہندوستان کے دونوں بڑی فرقوں نے برطانوی پلان بجنسہٖ قبول کر لیا ہے ــــ اور کل جو چیز ناقابلِ تصور تھی آج وہ ٹھوس شکل میں نظر آرہی ہے۔ انگریز اب جون ۱۹۴۸ء کی بجائے اگست ۴۷ء میں ہی ہندوستانیوں کو اختیارات سونپ کر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے تفویض اختیارات کا بل اس ماہ کے آخر تک منظور ہو جائیگا اور ہندوستان و پاکستان کو علیحدہ علیحدہ اختیارات دیدیئے جائیں گے

اس وقت ریاستوں کا مسئلہ ضرور تشویش انگیز بنا ہوا ہے۔ بعض ریاستوں نے برطانوی اقتدار کے خاتمہ پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا ہے، کانگریس نے ریاستوں کے متعلق بہت ہی غلط روش اختیار کر لی ہے اور وہ اپنے اثر اور دباؤ سے ریاستوں کو دھمکیاں دے رہی ہے، برخلاف اس کے قائداعظم نے صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ ریاستوں کو اپنی آزادی کا پورا حق ہے اس وقت جبکہ ہندوستانی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے اور تقسیمی کمیٹیاں اپنے کاموں میں مصروف ہیں کسی بھی جماعت کا ریاستوں پر یہ دباؤ ڈالنا کہ وہ اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں اعلیٰ تدبر کی مثال نہیں ــــ یہ دراصل تخلیقی دور ہے، جب ہندوستان اور پاکستان کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں بن جائیں گی تو پھر ریاستیں خود آسانی سے یہ فیصلہ کر لیں گی کہ انھیں کس کا ساتھ دینا چاہئے ــــ اب ماضی کی تلخیوں کو یاد کرنا فضول ہے۔ ہندوستان دو ہو کر بھی ایک رہ سکتا ہے۔

اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے دونوں حکومتوں کی ہم آہنگی بیحد ضروری ہے ــــ دونوں حکومتوں کو اپنے اپنے علاقوں کے مصیبت زدہ عوام کی حالت سدھارنے کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہونا چاہیئے ــــ

فرقہ وارانہ فسادات کی لعنت کو دور کرنا لیڈروں کا فرض ہے ــــ آخر انسانی خون سے اب یہ ہولی کب تک کھیلی جائیگی ــــ کب تک انسانیت اور تہذیب ــــ وحشت اور بربریت کے ہاتھوں کراہتی رہیگی ــ!

(ادارہ)

یہ فنکار ——!

احمد ندیم قاسمی

صبک

اگر صرف "بہت پیارا انسان" کہنے سے آپ تمام انسانی خصوصیات کو حاطہ کر سکیں تو مجھے کہنے دیجئے کہ احمد ندیم بھی اُن میں سے ایک ہے، اور جو صرف محبت کرنے اور محبت کئے جانے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ ندیم کہنے کو عمر رسیدہ ہے نہ جہاندیدہ لیکن وہ بات جب کہیگا پتہ کی —— آپ اُس کی باتیں سنکر چونک پڑیں گے، اکثر بیٹھے بیٹھے اُچھل بھی پڑیں گے —— یقین کیجئے!۔ قدرت کا ہر انتخاب بے مثل ہے۔ جو کام جس کے سپرد کیا گیا ہے وہ اُس کی تکمیل کر رہا ہے۔ کرتا رہیگا۔ یہ ایک حقیقت ہے —— ناقابل انکار —— ! ندیم نے زندگی کے گرم و سرد حالات کو دیکھا ہی نہیں، سمجھا بھی ہے۔ صرف سمجھا ہی نہیں پہچانا بھی ہے اور یہی پہچان اُس کا وہ اعلیٰ ادبی شعور ہے جس کے آگے پنجاب کی سربلندیاں پہلے اور ہندستان کی ادبی قدریں بعد میں سرنگوں ہیں —— کون نہیں جانتا کہ وہ متضاد خصوصیات رکھتے ہوئے بھی ہر جگہ انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ اُس کی طبع رواں اور موئے قلم کی جنبشیں کہیں تھک کر رکنا نہیں جانتیں۔ جب گرد و پیش کے روح فرسا تاثرات عرصہ تک اُس کے ذہن و دماغ کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں تو وہ افسانہ لکھتا ہے —— لکھتا چلا جاتا ہے —— ماحول کی تلخی، پنجاب کی دیہی معاشرت اور ہندستان کے کروڑوں بھوکوں، ننگوں اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کی زندگی کی عکاسی اُس کا مشغلہ بن جاتا ہے اور جب کبھی اُس میں سویا ہوا انسان انگڑائی لیکر بیدار ہو جاتا ہے تو وہ پنگھٹ کی صبحوں اور شاموں میں ڈوب کر شعر کہتا ہے، کہتا رہتا ہے۔ لیکن ان رومان پرور فضاؤں میں بھی اُس کا قلم زندگی کے بوقلموں گوشوں کو نظرانداز نہیں کرتا —— وہ اپنے قلم سے وہی کچھ لکھتا ہے —— جو دیکھتا ہے —— جسے دیکھنے کے لئے قدرت نے اُسے غلام آباد کے ایک غیر معروف علاقہ میں جنم دیا ہے —— اس غیر معروف علاقہ کو لوگ انگہ کہتے ہیں، انگہ جہاں ندیم نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے گذارے ہیں —— جہاں اُس نے شعوری اور لاشعوری کیفیات کو سمجھا اور پرکھا ہے —— جہاں اُس نے گہوارۂ طفولیت سے ہوش کی منزل تک غم و خوشی کے زمانے دیکھے اور بہتر زندگی کی تعمیر کی طرف قدم بڑھایا —— !

ندیم بحیثیت ادیب و شاعر شہرت کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں —— اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُس کی فنی قدریں مسلسل ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہیں —— کرتی رہیں گی —— ! یہی وہ اُس کا اعلیٰ شعور ہے جو اُسے دوسرے فنکاروں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے —— یہی وہ اُس کی اعلیٰ ذہنی تربیت ہے جو برابر اُس کے صحیح مقام کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ بڑھا چلا جا رہا ہے —— اور مجھے تو کچھ ندیم کی وہ شاعرانہ صلاحیتیں ہی پسند ہیں جن میں اُس کی روح اُس کے احساسات و جذبات اور قلب کی وسعتیں دھڑکتی محسوس ہوتی ہیں۔ صرف اُس کی ہی نہیں —— ہر پڑھنے والے کی —— ہر حساس انسان کی —— ہر اُس انسان کی جو دل رکھتا ہے —— جس کے دل کی وسعتوں میں دھڑکن ہوتی ہے۔ جو صرف اس لئے دھڑکتی ہیں کہ دوسرے کے دل بھی دھڑک سکیں —— زندگی بھی تو شاید ایک دھڑکن ہی ہے —— !

ہاں اور آخر میں یہ بھی سن لیجئے کہ اب وہ انگہ کی وادیوں سے دور، پشاور کی حسین پہنائیوں میں، اتھر کی لہروں پر مست خرام ہے —— کاش یہ خرام اُس کی سیماب صفت طبیعت کو پسند آجائے! اور وہ خود کو زندگی کے غموں کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال سکے —— !

سنگ و خشت

دیرشس

آجکل کچھ قادریوں، بدایونیوں اور افغانیوں نے معلوم ہوا ہے کہ "ترقی پسند ادب" کی تابناکیوں کے سامنے اپنے "چراغ خانہ" کو بجھتا دیکھکر "شمع محفل" بننے کے لئے بحرِ ہند کے پایاب ساحل پر غوطے لگانا شروع کر دیئے ہیں اور مذہب کا نام لیکر اپنی "سخت جانی" کا ثبوت دے رہے ہیں — معاملہ اگر صرف یہیں تک ہو جاتا تو اسے "برساتی ٹرّ" سمجھکر ٹالا جا سکتا تھا — لیکن پچھلے دنوں ان "مفکرین" نے بمبئی میں ترقی پسند مصنفین کے جلسہ کی "ریہرسل" تک کر ڈالی

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد

"آستانہ" دہلی — وہ صحیفہ ہے جو نام نہاد ترقی پسندی کے موجودہ دور میں مسلمان نوجوانوں کو الحاد اور بے دینی کے تباہ کن سیلاب سے بچانا چاہتا ہے" — لیکن اس تبلیغی رسالہ کے اگلے صفحات پر جلی عنوانات سے نوجوانوں کے کان میں یہ مشورہ دیا گیا ہے:— "جوانی کی واپسی کا ٹکٹ خرید یئے"۔ "پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی" "بغیر آپریشن — شرطیہ علاج" — کیا مدیر مستحسن اس "صنعت تضاد" پر روشنی ڈالیں گے — یہ اور بات ہے کہ یہ سب گھر ہی کی چیزیں ہیں — تبلیغ کے ساتھ — "اعادۂ شباب" کتنا خوش نما اور ترقی پسندانہ سودا ہے — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

ہمارے دوست مشہور افسانہ نگار مرزا ادیب لاہور سے لکھتے ہیں:— "مزے سے بھوپال میں بیٹھے ایڈیٹری کر رہے ہو، تمہارے دشمنوں کو خبر لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم غریبوں پر قیامتیں گذر گئی ہیں اور گذر رہی ہیں۔ ہماری مکانات بھی شعلوں کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکے! دیواریں گر گئی ہیں سامان کا بہت نقصان ہوا ہے، کتابوں کا ذخیرہ ضائع ہو گیا ہے، کافی عرصہ سے ادبی دنیا کی خبر نہیں — کیا ہو رہا ہے آجکل — ہم جانتے ہیں زندہ دلان پنجاب افسردہ ہیں — مت گھبراؤ خاک و خاکستر میں ایک نئے نظام کی تعمیر نظر آ رہی ہے۔ ان واقعات سے ہماری ایڈیٹری کا سارا مزہ کرکرا ہو رہا ہے۔

جموں (کشمیر) سے موہن یاور خوش خبری سناتے ہیں:— "اگر ہو سکا تو آئندہ ایک افسانہ بھیجوں گا — جس کے تخیل تک کرشن چندر کے اچھوتے خیال نہ پرواز ہوئے ہونگے — وہ شاہکار جسے بارش کے دنوں میں لکھنے کا تہیہ کر چکا ہوں، جوں ہی بارش ہوئی — لکھ کر حاضرِ خدمت کروں گا — "آمدِ برشگال" آپ کی "تخیل پروازی" قابلِ داد ہے — ہاں خوب یاد آیا، پانی پڑتے ہی بہت سی چیزیں خود بخود ابھر آتی ہیں۔ کرشن چندر کا تخیل — ؟ اب آپ کے سامنے کہاں پرواز کریگا — وہ تو سولائڈ میں جذب ہو کر رہ گیا ہے — ذرا ٹھہریئے آپ کے خط پر یہ کیا چھپا ہوا ہے؟ مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے!۔

اب ذرا دفتر شاہی کی ایک ناقابلِ برداشت "ترکتازی" ملاحظہ فرمایئے — دلی کا ایک خط ہے:—

میری بھائی کی شادی ۲۰ رمئی ۱۹۴۷ء کو ہونیوالی تھی، میں نے ۱۶ رمئی کو ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹیز کو ٹرک کے عارضی پرمٹ کے لئے درخواست دی تاکہ ایک پرائیویٹ ٹرک آمد و رفت کے لئے استعمال کیا جا سکے —" ۵ رجون کو یعنی تقریب کے سات دن بعد جواب موصول ہوا کہ پہلے فیس اور اسٹامپ وغیرہ کے لئے روپیہ بھیج دیجئے — کہیئے دفتری کارگذاریوں کا کیسا لاجواب شاہکار ہے!۔

لارڈ ویول سابق وائسرائے ہند نے کہا: بچہ پیدا ہوتے وقت زچہ کے سخت درد ہوتا ہے — اس طرح انھوں نے تقسیم ہند کو دو بچوں کی پیدائش سے تعبیر کیا ہے — اب ہندوستانیوں کو غالب کی زبان میں یہ کہنے کا موقع نہیں ملیگا ؎

درد منت کشِ دوا نہ ہوا!

آبگینے

اشارے
سوتے جاگتے
زمان و مکاں
سماج کے سائے تلے
آج
مشورہ
پس منظر
افکارِ حکیمانہ
نیا دور
رعنائیاں
سلسلے
یہ آگ اور خون
درد انے
بعد از وقت
سوچ

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

اشارے

نہ دیکھ وقت سے کجلا چکے ہیں کتنے راگ
جواں ہیں دیکھ ابھی کتنے زمزموں کی سہاگ
جو کھلکھلا کے خود اپنے بھی غم میں ہنس نہ سکا　　نزاکتِ غمِ خاطر نواز کیا جانے

کسے خبر کہ تلاطم ہیں کس سفینے میں
خرد کے زخم ہیں کتنے جنوں کے سینے میں
جو زہر پی نہ سکا ہو خود اپنے ہاتھوں سے　　وہ "خانہ ساز" شرابوں کا راز کیا جانے

غبارِ غم میں جہاں پاؤں ڈگمگاتے ہیں
وہاں ہنسی کے بھی کتنے مقام آتے ہیں
گل و سمن میں الجھ کر جو رہ گئی ہو نگاہ　　جمالِ برق نشیمن نواز — کیا جانے

اُفق سے جھانکنے والی سیاہیوں کی ہجوم
دیئے جلا چکے کتنے کسی کو کیا معلوم
کھلا ہو چاند کے سائے میں جس کا رختِ سفر　　وہ پھوٹتی ہوئی کرنوں کا راز کیا جانے

جہاں سفینے کناروں پہ ڈوب جاتے ہیں
اُجالے میتِ نجم و قمر اُٹھاتے جاتے ہیں
فریب خوردۂ منزل ہیں کارواں کتنے　　یہ رازِ خضرِ مسافر نواز کیا جانے

نہ آفتاب کا غم کر نہ ماہتاب کا غم
نگاہ و فکر کی لَو تیز کر قدم بقدم
تری نظر کہ ہے نجم و قمر کی زندانی　　ترے ضمیر کی صبحوں کا راز کیا جانے

پروفیسر شور (علیگ)

سوتے جاگتے

آجتک خستہ و بوسیدہ لبادوں کے تلے
زندگی نیند کی آغوش میں ڈھلتی ہی رہی

اور حالات کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ
خود مہ و سال کی زنجیر پگھلتی ہی رہی

کتنی صدیوں کے پُراسرار گھنیرے بادل
چیختے اور گرجتے ہوئے گذرے ہیں یہاں

کتنے مفلوک زمانوں کے بھیانک سائے
تلخ افسانوں میں جکڑے ہوئے اُٹھے ہیں یہاں

کتنے مبہوت مظالم کی کڑی دیواریں
سرد آہوں کو چھپائے ہوئے آراستہ ہیں

کتنے ناکارہ دماغوں کے تراشے ہوئے بُت
ذہن آدم کے ہر اک گوشہ میں پیراستہ ہیں

اتنے تلخاب و ستم گیر حوادث سہہ کر
زندگی درد کو سینے میں دبا کر جاگی

اور پھر جاگ کے دیکھا تو وہی عالم تھا
وہی چیخیں وہی آہیں وہی بیدادگری

وہی حالت تھی تعفّن زدہ میخانے کی
وہی ٹوٹے ہوئے ساغر تھے وہی پیمانے

وہی محفل وہی چہروں پہ جمی گردِ ہراس
وہی دیپک تھا وہی رقص وہی پروانے

اُنھیں صدیوں کے پُراسرار گھنیرے بادل
آج بھی سر سے اسی طرح گذرتے دیکھے

انھیں مفلوک زمانوں کے بھیانک سائے
ذہنِ آدم کے ہر اک سمت بکھرتے دیکھے

اور ایسے میں لرزتی ہوئی سہمی ہوئی زیست
سر جھکائے ہوئے یوں سوچ رہی ہے جیسے

ابھی ظلمات کی پہنائی سے ہونگے تاباں
سُرخ و شفّاف ستاروں کے چمکدار دیئے

احمد ریاض

زمان و مکان!

خدا نہیں؟ - نہ سہی، ناخدا نہیں؟ - نہ سہی
ترے بغیر کوئی آسرا نہیں، نہ سہی
تری طلب کا تقاضا ہے زندگی میری
ترے مقام کا کوئی پتہ نہیں، نہ سہی
تجھے سنائی تو دی - یہ غرور کیا کم ہے!
اگر قبول مری التجا نہیں، نہ سہی
مرے چمن میں تو برسوں کے بعد پھول کھلے
تری بہار گری برملا نہیں، نہ سہی
تری نگاہ میں ہوں، تیری بارگاہ میں ہوں
اگر مجھے کوئی پہچانتا نہیں، نہ سہی
میں ابتدائی سُکھوں کے سہارے جی لوں گا
مرے دُکھوں کی کوئی انتہا نہیں، نہ سہی
شبِ سیاہ کی تاریکیوں کا ساتھ تو ہے
کوئی ستارہ مرا رہنما نہیں، نہ سہی
نہیں ہیں سرد ابھی حوصلے اڑانوں کے
وہ میری ذات سے بھی ماورا نہیں، نہ سہی
وہی ندیم - وہی حسن کا قصیدہ نگار
ترے حضور اگر لب کشا نہیں، نہ سہی

احمد ندیم قاسمی

سماج کے سائے تلے

مانا کہ سماج کے سائے تلے — دو روحوں کو آرام نہیں
خود ساختہ آقا کے دل میں — سختی ہے لچک کا نام نہیں

یہ جبّے اور یہ عمامے — یہ دیوتا ہیں۔ کیوں دیوتا ہیں؟
اِن ایسے دلوں کو کچھ نہ کہو — یہ دونوں جہاں کے مولا ہیں

کیا فکر انھیں گر طوفاں میں — اُمید کی نیّا ڈولتی ہے
آہوں کی نازک شاخوں پر — دُکھیا آشا پر تولتی ہے

گو عشق و وفا کی آنکھوں میں — کچھ فرق سفید و سیاہ نہیں
مجبور مگر مجبور رہا — مجبور نہیں مختار نہیں

دوشیزہ اونچے گھر کی بھی — دیکھی نہ گدا کی کٹیا میں
سپنے میں سماج کے بندھن بھی — یوں کٹتے نہ دیکھے دنیا میں

لیکن میں سماج کی رسموں کو — کیوں کوسوں تیری جدائی پر
روؤں اِن ارضی فرشتوں کو — ان کی محفل آرائی پر

گر اِن کی جگہ ہم خود ہوتے — ہم کہتے یہ اپنا کام نہیں
مانا کہ سماج کے سائے تلے — دو روحوں کو آرام نہیں

اختر ہوشیارپوری

آج

یہ کون ادائے خاص سے پہلو نشین ہے آج؟!
دُنیائے حُسن و عشق کے زیرِ نگیں ہے آج

پامالیوں کو اوجِ ثریا نصیب ہے
قبضہ میں مُشتِ خاک کے مہرِ مبیں ہے آج

فیضِ قدم تو دیکھئے کافرِ جمال کا!
کعبہ سے بڑھ کے اوج میں دل کی زمیں ہے آج

مہکے ہوئے ہیں ارض و سما بوئے زُلف سے
یوں دوش پر وہ سلسلۂ عنبریں ہے آج

شبنم فشاں عرق سے رُخِ لالہ فام ہے
قشقہ سے گلفروش کسی کی جبیں ہے آج

جیسے کنول کا پھول ڈبو دو شراب میں
چہرہ فروغِ بادہ سے یوں احمریں ہے آج

شہد و شہاب و شعلہ و شبنم لیئے ہوئے
آلودۂ شراب، لبِ شکریں ہے آج

پڑتی ہے چھوٹ آئینۂ آفتاب پر
تابانیٔ جمال کی کچھ حد نہیں ہے آج

اللہ رے جوشِ حُسن کہ از فرق تا قدم
دیکھو نگاہ بھر کے جہاں دل وہیں ہے آج

تلخابۂ حیات میں ہے چاشنیٔ مے
زہرابِ غم میں ذائقۂ انگبیں ہے آج

دِل اُس نگہ کے ناز اُٹھانے میں محو ہے
کہہ دو غمِ جہاں سے کہ "فرصت نہیں ہے آج!"

چھائی ہوئی ہے قربتِ جاناں کی دلکشی
جس شے کو کائنات کی دیکھو حسیں ہے آج

وہ اور دل کے پاس یہ کیا انقلاب ہے؟!
محور سے اپنے دور تو دنیا نہیں ہے آج؟!

کس راستہ کے موڑ پہ دل ہے کسے خبر؟!
منزل کہیں میانِ گمان و یقیں ہے آج!

آ موت آ، کہ عشق کو اب جاوداں بنا!
جینے کی اور دل میں تمنا نہیں ہے آج

سرخوش عسکری طباطبائی

مشورہ

(اُس ہستی کے نام جس نے مجھے شاعر بنادیا)

(۱) تمہارے ایام ہیں روانہ		گلابیوں میں، صباحتوں میں
تمہاری راتوں کا آشیانہ		حسین نیندوں کی راحتوں میں
لطیف جذبات کی حدوں کو فضائے ہستی میں تنگ کردو!
یہ وقت ہے وقتِ بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کردو!

(۲) یہ سچ کہ تکتے ہیں چاند تارے		ہمارے خوابوں کی وادیوں کو
ملے ہیں تقدیر کے سہارے		اُمید کی شاہزادیوں کو
مگر محبت کے زمزموں کو فغانِ توپ و تفنگ کردو
یہ وقت ہے وقتِ بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کردو

(۳) کبھی یہ سوچا کہ غم کے بس میں		حیات کی باگ ڈور کیوں ہے؟
جگہ جگہ ہند کے قفس میں		غلام بھوکوں کا شور کیوں ہے؟
بدل دو ماحول، زندگی کو نثارِ ناموس و ننگ کردو
یہ وقت ہے وقتِ بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کردو

(۴) دلی تقاضے کچل کچل کر!		ہر اک مصیبت کو جھیلنا ہے
ہر اک ارادہ کا رُخ بدل کر		دہکتے شعلوں سے کھیلنا ہے
نزاکتوں کو لطافتوں کو حریفِ فولاد و سنگ کردو
یہ وقت ہے وقتِ بیقراری سکوں سے آغازِ جنگ کردو

شمس نوید

پس منظر

تری زمیں سے تری آسماں سے کھیل چکا
تری قسم ترے کون و مکاں سے کھیل چکا

تری قسم تری تابانیٔ حسیں کی قسم
ہر ایک جلوۂ حسنِ جواں سے کھیل چکا

فلک پہ چاند ہے شاہد گواہ ہیں تارے
ترے لئے میں تری کہکشاں سے کھیل چکا

ہے اب تو خواہشِ خوابِ سُبکِ محبت میں
کہ میں گرانیٔ خوابِ گراں سے کھیل چکا

نہ کارواں ملا نے میرِ کارواں مجھ کو
ہزار گردِ پسِ کارواں سے کھیل چکا

نہ ملنا تھا نہ ملا کیس رنگ و بو نہ ملا
ہر اک بہار ہر اک گلستاں سے کھیل چکا

نہیں ہے دعویٔ شعر و سخن مجھے یکتاؔ
میں خود فریبیٔ طبعِ رواں سے کھیل چکا

یکتاؔ امروہوی

افکارِ حکیمانہ

دیندار بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں ساقی
کفار بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں ساقی
جب زیست ہے زندگی تو ساغر میں ترے
میخوار بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں ساقی

کافر ہو کہ مفتیٔ زمانہ ساقی
بیٹھے ہیں یہاں برادرانہ ساقی
ہے تیرے کرم سے تیرے رندوں کا بھی دل
وسعت میں ترا شراب خانہ ساقی

ہوں رند ترا ز روزِ اوّل ساقی
کر دے مرے کیف کو مکمل ساقی
پہنچے ترا فیض اس سے پیمانوں تک
اس دل کو بنا لے اپنی بوتل ساقی

تخلیق پہ اعتبار تجھ کو بھی نہیں
تبدیلیوں میں قرار تجھ کو بھی نہیں
مجبور کو دفعتاً بنا دے مختار
شاید کہ یہ اختیار تجھ کو بھی نہیں

سرمایۂ افکار کہن ہی نکلا
خوش فکریٔ شیخ و برہمن ہی نکلا
حرکت سے تحرک کا اضافی رشتہ
آخر کو دماغوں کی تھکن ہی نکلا

جمیل مظہری

نیا دَوْر

آؤ ہم ایک نئے دور کا آغاز کریں
سوزِ جاوید سے تخلیق نیا ساز کریں

عہدِ ماضی کی ہر اک بات فسانہ بن جائے
نغمہ کے روپ میں ڈھل جائے ہر اک نالۂ دل
خود قدم لینے کو آجائے ہماری منزل
بربطِ غم کی نوا ایک ترانہ بن جائے

حال کا دلکش و ضوبار فسانہ چھیڑیں
سرمدی تاروں پہ لہرائے محبت کا سرور
نغمۂ و نور سے ہو جائیں دو عالم معمور
بربطِ شوق پہ اک ایسا ترانہ چھیڑیں

اک نئے رنگ میں ڈھل جائے ہمارا ماحول
دن نئے راتیں نئی، زیست کے سامان نئے
دل کے جذبات نئے روح کے ارمان نئے
نو بہ نو جلووں سے معمور ہو سارا ماحول

رقص کرتی ہوئی مستانہ ہوائیں آئیں
محفلِ شوق میں ہوں ساقیٔ گلفام نئے
خم نئے، رند نئے، بادہ نیا، جام نئے
جھوم کر میکدہ بردوش گھٹائیں آئیں

اپنے بیتے ہوئے لمحے نظر انداز کریں
مئے تقدیر کا اک جام گوارا لے کر
شہپرِ حورِ محبت کا سہارا لے کر
رفعتِ کون و مکاں کو تہِ پرواز کریں

یوں محبت کو زمانے میں سرافراز کریں
آؤ ہم ایک نئے دور کا آغاز کریں

فدا شاہجہانپوری

رعنائیاں

بے قراری دل کی فطرت ہو تو کوئی کیا کرے
شب دھڑکا کرے شام و سحر تڑپا کرے

حُسن مختارِ تغافل عشق مجبورِ نیاز
تا بہ کے کوئی فریب آرزو کھایا کرے

دل کو ہے بے اختیاری پر بھی اتنا اختیار
عشق کو بدنام کر کے حُسن کو رُسوا کرے

کیا شبِ غم کیا شبِ غم کی قیامت خیزیاں
تیری یاد آتے ہی مجھ کو نیند آ جایا کرے

ہر گھڑی تسکین دل کو چاہیے حُسنِ خیال
حشر اُٹھتا ہے اگر جذبات میں اُٹھا کرے

لے اڑیں دل کو خیالِ حُسن کی رعنائیاں
گوشۂ خلوت میں بیٹھا کوئی شرمایا کرے

جوشِ حسرت میں مجال جنبشِ لب بھی نہیں
دردمندِ عشق اکرمؔ شکوۂ غم کیا کرے

اکرم دھولیوی

سلسلے

اگر تکمیلِ ربط و ضبط فرمانے کو جی چاہے
ذرا خود بھی تڑپ لینا جو تڑپانے کو جی چاہے

سمجھ لیجئے کہ اب دورِ بہار آیا محبت میں
بکیفِ خاص جب دیوانہ ہو جانے کو جی چاہے

وہیں سے ابتدائے منزلِ مطلوب ہوتی ہے
جہاں ہر گام پر مایوس ہو جانے کو جی چاہے

اصولِ عشق شانِ ضبطِ غم معلوم ہے لیکن
میں آخر کیا کروں جب اشک برسانے کو جی چاہے

انھیں اے جذبِ کامل تو ہی آ بزمِ محبت میں
مرا ذمہ جو واپس لوٹ کر جانے کو جی چاہے

گناہِ توبہ تو پھر بڑھ کے دامن تھام لیتی ہیں
خطائے شوق پر جب دل ہی پچھتانے کو جی چاہے

مبارک ہو تمھیں چھپنا مری چشمِ تمنا سے
مگر ایسا نہ ہو پھر سامنے آنے کو جی چاہے

وہی اشعار ہوتے ہیں اسدؔ ہم زندگی ساماں
جنھیں اہلِ جہاں کا خود کبھی دہرانے کو جی چاہے

اسد۔ بھوپالی

یہ آگ اور خون

آج بلوؤں کی بھڑکتی ہوئی آگ
جس کو بھارت کے سپوت
اپنے دامن سے ہوا دیتے ہیں
داغ بن کر کبھی ماتھے کی سیاہی ہوگی
یہ سسکتی ہوئی لاشیں
یہ اُمنڈتے ہوئے دل
آہ! خونخوار گِدوں کے لقمے
زندہ قوموں کو ہنسی آتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ بھارت کے سپوت
کتنے وحشی ہیں، درندے ہیں یہ لوگ
بھائی کو بھائی سے نفرت ہے، عناد
آج بھارت کی زمیں خون کے آنسو روئی
باعثِ ننگ ہے بھارت کے لئے
'فرقہ وارانہ فساد'
کیا یہی ہاتھ بڑھاؤ گے حکومت کے لئے — ؟
بھائی کے خوں سے رنگے ہیں جو ابھی!
کیا عزائم کی بلندی ہے یہی — ؟
کیا یہی رہ گئے مذہب کے اُصول — ؟
اور اہنسا کے اُصول'
خندہ زن کیوں نہ ہوں تہذیب پہ لوگ
کیوں نہ تاراج ہو بھارت کی زمیں
زندہ لاشوں کا تو مدفن ہی تھا بھارت لیکن!
فرقہ وارانہ فسادات کا مرکز بھی بنا — !!۔

قمر ہاشمی

دُردانے

سحر ہونے تک ——

فضا میں گونج اُٹھی دھڑکنوں کی موسیقی
چھلک چھلک گئے پُر کیف معصیت کے ایاغ
بتا رہی ہیں سحر کی دبی دبی آہیں
بُجھے حسین ستاروں کی عصمتوں کے چراغ

خراشیں ——

کیسے سہوں الٰہی یہ طوفان معصیت ؟
آتی ہیں روز دل پہ خراشیں نئی نئی
ہر روز ڈوبتی ہیں شرافت کی کشتیاں
ملتی ہیں سطح زیست پہ لاشیں نئی نئی

نغمے کی موت ——

خاموشیوں میں ڈوب کے، کشتی حیات کی
کس نے تغیروں کے بہاؤ پہ چھوڑ دی
وہ گاؤں سی پرے کبھی مایوس زیست نے
اپنی حسین بانسری روٹھ کے توڑ دی

خاطر غزنوی

بعد از وقت

گناہ کرکے پشیمان ہو رہا ہوں میں
مرا ضمیر مجھے کوستا ہے رہ رہ کر
دل و دماغ میں جاری ہے اک ہلچل سی
گناہگار ہوں لیکن یہ چاہتا ہوں میں
مری جبیں سے گناہوں کے داغ ڈھل جائیں
ڈرا سکیں نہ مجھے یہ گناہ کے عفریت
گناہ مجھ سے ہوئے کیوں یہ سوچتا ہوں میں

....

جو کرچکا ہوں اُس کا خیال آئے مجھے
میں اس دہکتے جہنم میں جل نہیں سکتا
میں اپنے کردہ گناہوں کو بھول جاؤں کاش!
ڈرا رہے ہیں وہ پھر خوفناک سائے مجھے!
چھپا کے اپنے ذلیل و سیاہ چہرے کو
میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے دور بھاگ سکوں
مجھے یہ ڈر ہے کہ دنیا نہ دیکھ پائے مجھے

جمیل ملک

سوچ

خیرات

موت کے منہ سے نکل آیا ہے تنہا، اس لئے
بٹ رہا ہے مفلس و نادار میں صدقے کا بھات
سوچ میں گم ہوں کہ ہر انسان کے افعال میں
کارفرما کیوں نظر آتا ہے خود غرضی کا ہات؟

ایک نظارا

جل رہی ہے بدھ میں ڈوبی نرم رو، بانکی ہوا
چاند کی معصوم کرنیں ریت پر بنتی ہیں جال
دور اُن کھیتوں میں دو معصوم عزیزہ [illegible]
دے رہے ہیں سازِ خاموشی پہ معانی کی تال

یاد

سر اٹھاتی ہے تخیل کی تہوں سے ایک یاد
دور سے کانوں میں کبھی اڑ آتا ہے عجب ہلکی سی تان
ڈوبتا جاتا ہوں میں گہری خلاؤں میں ندیم؟
سوچتا ہوں کیا ہو گر کوئی ڈرا دے میری جان؟

دل کا روگ

بھیگی بھیگی سی نگاہیں، سہمی سہمی انگلیاں
کانپتے ہونٹوں پہ دل کا مدعا آتا نہیں
سوچتا ہوں کس قدر جانکاہ ہے یہ دل کا روگ
جو محبت کا ڈسا ہو وہ شفا پاتا نہیں

بدلتے مہماں

اب خزاں ہے کارفرما، اب بہاروں کا خروش
اب امیدوں کے پہرے ہیں، اب یہاں یاس حکمراں
اب کوئی آیا ہوا ہے، اب کوئی جانے کو ہے
ایک رونق ہیں جہاں کی یہ بدلتے میہماں

استفسار

میں سوچ میں گم ہوں کہ کوئی مجھ کو بتائے!
کیوں قہقہہ مسحور ہے اشکوں کی لڑی سے؟
کیوں پھول کے دامن میں ہیں کانٹوں کی قطاریں؟
کیوں سوکھی ہوئی شاخ میں پوشیدہ ہے کونپل؟
کیوں اجڑے چمن زاروں سے اُٹھتی ہیں بہاریں؟

جاوید قمر

آبشار

چکراتے ہوئے

بازگشت

یہ ہے ایک گلی

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت !

انور عظیم

چکراتے ہوئے

"راہ چلتے کیچڑ اچھالتی چلتی ہے، ڈائن، توبہ توبہ ——" نیند اس کی آنکھوں کو چھوڑ کر محاذ سے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ لیکن اس کے تھکے ہوئے لمس کا احساس اب تک تر و تازہ تھا۔ اس کے کانوں میں دوڑتا ہوا، گرم گرم جملہ پناہ لینے لگا اور اس نے پہچان لیا، اس کی بیوی گلا پھاڑ پھاڑ کر دائی پر برس رہی تھی۔ قریب قریب یہ روز کا دستور تھا۔ جتنا وہ امن پسند تھا، اتنا ہی اس کی بیوی جنگ جو تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ دونوں میں اگر کوئی چیز مشترک تھی تو وہ ان کا افلاس تھا، ان کی آپس کی محبت اور ہمدردی، اور پھر ایک درجن کی چوتھائی پر قابض وہ تین بچے جن کی چیخ پکار سے اس کی نیند اور آرام کا کچومر نکلتا رہتا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی سوتا رہے۔ رات گئے تک وہ فائل پر اپنی منڈلائی ہوئی نیند کو قربان کرتا رہا تھا۔ ابھی صبح نے انگڑائی لی تھی اور اتنی شدت سے سائرن بجنے لگا تھا کہ اب اس کا سونا دوبھر تھا۔ اسے اپنی بیوی کی اس بدتمیزی پر غصہ آیا، لیکن اس نے سچ مچ غصہ تھوک دیا۔ اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس کے منہ سے بڑا سا ٹکڑا بلغم کا اُڑ کر اس کے مغل سینڈل پر پڑ گیا۔ اور جیسے یہ گالی بنکر اس کی روح میں گھل مل گیا۔ اس نے اس مغل سینڈل کو کتنی مشکلوں سے خریدا تھا۔ اس کو اس سینڈل سے پیار تھا۔ چودہ روپئے کا سینڈل ایک بینک کا کلرک پہننے کی ہمت کرے، کمال کی بات تھی۔ دو روپئے ماہانہ کے حساب سے اس نے آغا کو روپئے ادا کرنے شروع کئے۔ کابلی شریف، تجارتی، بھاری بھرکم بیچارے، کسی طرح دوگنی قیمت پر، کلرک اور اوسط درجے کے روندے ہوئے لوگوں کو اس طرح کی چیزیں استعمال کرنے کا موقع تو دیتے ہیں۔ کتنی مہربانی تھی۔ لیکن اس کا مغل تو مغلوں کا بادا آدم تھا۔ کمبخت ٹھیک پہلی تاریخ کو شام کے وقت اس کے دروازے پر منڈلاتا رہتا اور ادھر وہ چکر کھاتا ہوا، تنخواہ کا حساب انگلیوں پر لگاتا، قرض کی گرہیں کریدتا، مکان پہنچا نہیں کہ ڈنڈا بجنے لگا، سمنٹ کے برآمدے میں۔ بس گردن پر سوار، پہلے پوری سنجیدگی سے اپنے دو روپئے وصول کر لیتا، پھر ذرا مسکراتا، ڈاڑھی میں خلال کرتا اور بال بچوں کی خیریت پوچھ پاچھ کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بھاری قدموں کے ساتھ گلیوں کی پتلی ہوتی ہوئی، سمٹتی ہوئی انتہا پر پہنچ جاتا، اکڑتا، اور جب تک وہ اس کی نظروں سے مٹ نہ جاتا وہ اندر نہ جاتا۔ اور رات ہی کا تو واقعہ تھا کہ اس کی بیوی نے محض اس سینڈل کی وجہ سے اس کو ہزاروں صلواتیں سنا ڈالی تھیں۔

"تمہیں کیا۔ گھر میں کسی کے پیٹ میں اناج پڑے یا نہ پڑے، بس اپنی لُو تو تو سے غرض، زینو بخار سے پھنک رہا ہے مگر کس کے کان پر جوں رینگتی ہے، چودہ روپئے کے سینڈل پہنے چلتے ہیں، روزی کا ڈھنگ نہیں، کمو جوتا ڑی ——، یہاں کپڑا ڈوں پچڑکاری پھرتی ہوں وہ بھی گت کا نہیں، —— دنیا جہان کے مرد ہوتے ہونگے، لیکن ایسے نہیں"

اور کلرک ہونے کے باوجود اس کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں اور خون میں اُبال آگیا تھا۔ آخر اس کی بیوی نے کیا سمجھ کر اسے طعنہ دیا تھا۔ کسی دوسرے کی کمائی تھوڑا ہی وہ کھاتا پہنتا تھا ——؟ لیکن یہ بھی تو واقعہ تھا کہ اس کا زینو بیمار تھا —— اسے بخار تھا، کھانسی تھی، ناک دھڑتے سے بہہ رہی تھی، پھر بھی بیوی کو چپ کرنا ہی تھا، اس کی بکواس موٹر سائیکل کی طرح

پھٹ پھٹ کرتی جا رہی تھی۔

"اور نہیں تو کیا، میں کماتا بھی تو ہوں، چلو موج اڑاتا ہوں۔ بڑا دیکھا ہے تم نے سارے جہان کے مردوں کو، ارے وہ تو مجھ سا شریف تھا کہ نباہ دیا۔ کیا ہے رات دن کی تو تو، میں میں۔ ہر وقت کے جلے پھپھولے پھینکتی رہتی ہو ——— چونچ مارتی رہتی ہو، وہ تو میں اُس وقت قائل ہو گیا تھا جب تمہیں بیاہتے ہی بے نیل ہو گیا تھا اور مشکل سے ایک سال بھی نہیں بیتا میاں خیر و پھسکنے لگے" اور اس کے بعد ذاتی لعن طعن پر اتر آیا جس میں چھپی چھپی گالی بھی تھی، وہ ہمیشہ محبت کی تان اسی طرح کی کھوکھلی باتوں پر توڑ دیتا تھا اور اس کی بیوی اس کی جوابی بجائے اس کی تیکھے دار مغزی کو دیکھ کر صرف بدبدانے لگتی۔

اس نے تکیے کے نیچے سر گھسیڑ لیا کہ کان میں چیخ پکار کا گذر نہ ہو، لیکن اس کی بیوی تو قسم کھا کر اس کے پیچھے پڑی تھی اس کی اماں میں یہ بہت بری لت تھی، پانی لانے جاتی تو دو چار ہاتھ محلے والوں سے لڑ کر آتی، کھری کھری سنا دیتی، اور اگر لڑائی کا رُخ گالی گلوج کی طرف مڑ جاتا تو، پھر اس کی اماں لمبے لمبے ہاتھوں کو پھریرا بنا کر کچھ اس آن بان سے مقابلہ پر آتی کہ دشمنوں کے کشتے کے پشتے لگ جاتے۔ گالی بکنا بھی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں اور یہ روگ بالکل اس کے بس کا تھا۔ جہاں دیر ہوتی تو اس کی بیوی کا پارہ گرم ہو جاتا، بس اندر آنے کے بعد پانی پت کی خانہ ساز جنگ شروع ہو جاتی۔ آخر اس میں اچھائیاں بھی تو بہت سی تھیں۔ دو تین مہینے کی تنخواہیں ہمیشہ اس کے یہاں اُدھار رہتیں۔ مگر اس کے منہ پر میل آ جائے کیا مجال۔ اس طرح کی آئے دن کی جنگوں سے اس کی نیند بلبلا اٹھتی۔ اس کے دماغ میں تیزاب دوڑنے لگتا۔ وہ اپنی بیوی سے عاجز تھا۔ بیوی اس سے نالاں تھی، مگر خدا اور رسول کے سامنے دونوں نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی مان لیا تھا، اور اب فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے تنگ تکیے کو زور دیکر، موڑ کر اپنے چہرے پر ڈھانپ لیا مگر وہاں تو آواز نہیں تھی توپ کی گرج تھی، اس کا دماغ جھنجھنانے لگا اور آخر اس کی نیند کا میٹھا میٹھا جال، بدن کے جوڑ جوڑ میں ایک کھنچاؤ، سب کچھ مٹ مٹا کر رہ گیا۔ اور صرف ایک خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا کہ اس عورت کو عورت کس جانور نے بنایا۔ اس وقت وہ پوری جھنجھلاہٹ کی کیفیت میں تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں آتا ہوں، آرام کے لئے، چین کے لئے، سکون کے لئے، لیکن یہاں آتے ہی دوزخ کے شعلے لپٹنے لگتے ہیں میری جان کو۔ کما کر بھی دو اور طعن تشنیع بھی سہو۔ یہ بھی خوب۔ اور بھی تو میرے ساتھی ہیں —— کیا زندگی ہے ان کی۔ ٹھاٹھ باٹ ہے، صورت پر چمک ہے، رونق ہے، شادابی ہے۔ لیکن یہاں تو چہرے کو دیکھو تو معلوم ہو کہ دیمک چاٹی کتاب ہے۔ اس سے کیا اگر وہ حرام کے پیسے لیتے ہیں، مگر حرام کار بھی تو کہلوانا نہیں چاہتا۔ میں ایسا کر نہیں سکتا اس میں بیوی کا قصور نہیں۔ یہ تو اپنا جرم ہے۔ اس کے دماغ نے اس موڑ پر پہنچ کر اپنی بیوی کو معاف کر دیا، وہ ہمیشہ خاص ذہنی انتشار کی سڑکوں پر ہوتا ہوا اسی طرح کی فیصلے کی سرائے میں ڈیرہ ڈالتا۔

پھر فوراً ہی اس کی نگاہ سینڈل پر جا پڑی۔ اس کا چمڑا سوکھ رہا تھا۔ اور کیلیں دامن چاٹ رہی تھیں۔ اسے پچھلی رات کی بات یاد آ گئی۔ اسے بیوی نے بہت برا بھلا کہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ایک طرف دوسرا پلنگ تھا جس پر اس کی بیوی اور بچے سوتے تھے۔ اس کڑکڑاتے ہوئے جاڑے میں بھی انھیں لحاف نصیب نہیں ہوا۔ ایک کمبل اور دوہر ملا کر رات کٹ جاتی تھی، اور وہ خود تو ایک بوسیدہ کمبل سے نباہ کر رہا تھا۔ جیسے تیسے۔ درمیانی شب میں جب تارے بھی ٹھٹھر کر شل ہو جاتے ہوائیں آرے کی طرح چلنے لگتیں اور پھیپھڑوں میں برف کے پھاوڑے چلنے لگتیں، وہ اس وقت شدت خیال سے کام لیتا اور قوت ارادی کا معجزہ اس کی رگوں سے شعبدہ بازی کرنے لگتا، جاڑا پسپا سا ہو کر اس کے ذہن کو چھوڑ دیتا مگر باقی بدن کے حصوں پر اس کی فسطائیت دوڑتی رہتی۔ وہ غیر ارادی طور پر پائنتی شل تہوں کو رگڑ رگڑ کر بجلی کی ایجاد میں محو رہتا، لیکن برف کی کھال کی بنی ہوئی جرابیں ہزار کوشش کے باوجود اس کے پیروں سے نہ اترتیں۔ یہی حال اس کی بیوی کا تھا، اپنی ٹخنوں کو

چھاتی سے لگائے اور برفیلے ہونٹوں کو دانتوں کی چکّی میں دبائے، مگر اس کے بچّے رات بھر سب سب کرتے رہتے، کانپتے رہتے، کراہتے رہتے اور کبھی ماں کے جسم سے چمٹ کر رونے لگتے۔ شاید ان میں شدتِ خیال اور قوتِ ارادی کی کمی تھی، شاید ایسا ہی تھا اور ایسا بھی تھا شاید کہ وہ اپنے جسم اور دماغ کو ایک ہی چیز سے دو اثر لینے دینے کے روادار نہ تھے۔

اس نے دیکھا کہ اس کے بچّوں کا پیشاب پلنگ کے نیچے گاڑھا گاڑھا نشان چھوڑ گیا تھا۔ آنگن سے اس کے بچّوں کی چٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی، اس نے جھک کر اور جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی دھوپ میں بیٹھی تھی، اس کے چہرے پر بوکھلاہٹ تھی، آنکھوں میں رندھی ہوئی انگیٹھی کی پرچھائیں، ہاتھوں میں لرزش، وہ اپنے زینو کو بجانے کے باوجود ٹھنڈی ہوا میں رکھے ہوئے تھی، اس لئے کہ وہاں دھوپ تھی، دھوپ میں گرمی تھی، کمرے میں ٹھنڈک تھی، بچھونے میں بچّوں کے پیشاب کی کراہنت مہک رہی تھی۔ اس کی بیوی کا شلوکہ کہنی پر سے چیرے ہوئے تھا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا کی تیز باڑھ اس کے حلق کو ریت رہی ہو۔ اس کے دل میں ہمدردی کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ جیسے مالکہ کو کریدڈالنے سے دھوئیں کے آتشیں بگولے جھپٹ پڑے ہوں۔ اس نے آدھی رات تک اس سے لڑائی کی تھی، اس کی بیوی جو کچھ کہتی تھی اس میں کچھ سچائی بھی تو تھی، سینڈل کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی؟۔ وہ عورت تھی اس کی ساری رعنائی دھواں پھینک رہی تھی۔ اس کی حالت ٹنڈ منڈ سے پیڑ کی ہو گئی تھی۔ اور میں ہوں کہ اپنے ایک دوست کی نقل پر اُتر آیا۔ اس میں اور اس کے دوست میں فرق بھی تو تھا اس کی شادی ایک زمیندار کی لڑکی سے ہوئی تھی جہاں سے ہر دوسرے تیسرے مہینے اس کی جیب کو تازہ کمک پہنچتی رہتی تھی۔ اسے اپنی نادانی پر غصہ آ گیا۔ رات اپنی بیوی پر فضول کتنا گرم ہو گیا تھا۔ کوئی ایسی بات بھی تو نہ تھی۔ بیچاری نے کوئی بری بات بھی تو نہیں کہی تھی۔ انسان کی مجبوری اسے کڑوا کسیلا بنا دیتی ہے۔ اسے اپنے سینڈل سے نفرت ہو گئی۔ اس کا بچّہ بیمار تھا۔ اس کی بیوی کی کہنی جاڑے کی ٹھنڈی ہواؤں سے چھل رہی تھی۔ مہینہ کی آخری تاریخ تھی اور گھر میں غلّہ نہیں تھا، کپڑا نہیں تھا، دوا نہیں تھی۔ کھانا نہیں تھا۔ تو پھر وہ کماتا کیوں تھا؟۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ ننگے رہنا، بھوکے رہنا، بیمار رہنا —— اُف!۔

وہ اس ڈھرے پر پوری گرم رفتاری سے سوچنے لگا۔ غور کرنے لگا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں ہمیشہ اس طرح غمگین اور دلدوز باتیں گھنگھرو بن کر اس کے ذہن میں جھنجھنانے لگتیں۔ اور وہ اپنی زندگی، اپنی کلرکی، اپنی بےبسی، اور پھر ہر چیز سے نفرت پر مجبور ہو جاتا۔ اور آخر میں صرف ایک فیصلہ اس کے خیالات کے عروج پر پہنچکر اس کی زندگی کا راستہ روک لیتا، —— دونوں بانہہ پھیلا کر —— وہ آگے نہ بڑھ پاتا۔ اس کی آنکھوں کو گرم اور نرم تہیں دھندلا دیتیں۔ زندگی کے ہر زاویئے میں، ہر گوشے میں، لاشوں، بسکیوں اور پنجروں کا انبار لگ جاتا۔ موت کھڑی ہو کر اذان دینے لگتی۔ ایسے وقت میں وہ مدمدجہ اندھیں اور بوکھلایا بوکھلایا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر بادلوں کے ٹکڑے چپاں ہو جاتے اور شدید قسم کا اندھیرا اس کی آنکھوں میں سر نہوڑا کر بیٹھ جاتا —— زندگی کی لہر اس کی پلکوں کو چھونے لگتی ——۔ زہرناک نگاہیں خونیں پرچم بنجاتیں۔

زندگی اس روز بھی صبح کے گھوڑے پر سوار کچھ اسی انداز سے اس کے سامنے آئی —— ایسا انداز، جو اس میں احساس کی گھٹن بھر دیتا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی زندگی کا راستہ روک کر تھی۔ بدمزگی، افسردگی، قنوطیت اور سب کی ماں، موت کھڑی ہو گئی ہے۔ وہ گھر میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی مدقوق، درد انگیز اور رونی صورت پر نظر نہیں گاڑ سکتا۔ نہ وہ اپنے بچّوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جن کی آڑ میں آ کر اس کی بیوی اس سے لڑا کرتی تھی۔ اور وہ اپنی بیوی کو گنوار، اجڈ، لڑاکو، اور بےحس سمجھ کر اپنے دل کی آگ کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔

وہ کھڑا ہوگیا۔ گرم کوٹ کھونٹی سے اتارا اور پہن لیا۔ کوٹ پہن کر اس نے محسوس کیا کہ اس نے کوٹ نہیں پہنا۔ یہ تو گرد میل، اور پیوند کا ذخیرہ تھا۔ اُون اڑ چکا تھا۔ سوت باقی رہ گیا تھا۔ سات سال کا پُرانا جلتر کوٹ۔ اس نے کوٹ نہیں پہنا تھا۔ اس نے سات سال کی تاریخ اوڑھ لی تھی۔ اس نے ماضی کو اپنے جسم پر باندھ لیا تھا، چپکا لیا تھا جس میں اتنی سکت نہ تھی کہ تازہ دم، جوان اور طرار جاڑے کی چھبتی چلی جانے والی ہواؤں کا حملہ سہہ سکے۔ یہی کوٹ تھا، کوٹ جو اسے شادی میں ملا تھا، یہی کوٹ تھا، کوٹ جسے چھو کر بچے ماں کی چھاتی کی ملائمت کو بھول گئے تھے۔ اس کے دماغ میں پرانی باتیں ابھر نگیں ابال کھاتے ہوئے دودھ کی طرح۔ اور آہستہ آہستہ اس کا دماغ قسم قسم کی آوازوں، چیخوں اور پکاروں سے بھرا ہوا پنڈال بن گیا، کھچا کھچ۔ بڑے بڑے موٹر کے ہارن جیسے ہاکر دوڑ پر بجائے جا رہے ہوں، اسے چڑھانے کے لئے ——

بھونپوں، بھونپوں ———!

جب سات سال پہلے اس نے پہلی مرتبہ اس کوٹ کو پہنا تھا تو وہ روئیں سے لدا ہوا تھا۔ نرم نرم، گرم گرم۔ اس کے خوبصورت بسنتی چک کے نشانات کتنے بھلے لگتے تھے اور جیسے جیسے زندگی کی آنچ سلگتی گئی، —— اس کوٹ میں اندھا دھند اس کی زندگی کی تاریخ سماتی گئی، اس کی کلرکی، نوکری، بیوی کا چکیلا بدن، مسکراتا چہرہ، گرم بازو، گول گول کلائیاں، سب اس کوٹ میں بس گئے تھے، رومان، محبت، فراق اور قربت، سب کچھ۔ ان بخیوں میں بہت سے جولان قہقہے بھی چھپے ہوئے تھے۔ بہت سی مقدس اور محبت سے بھرپور یادیں۔ مگر وہ قہقہے معدوم ہو چکے تھے۔ وہ گول گول کلائیاں پنکھے کی ڈنڈیاں یا ہڈیوں کی قمچیاں بن گئی تھیں۔ بازوؤں میں جیسے گلیشیر بہتا رہتا ہو۔ اور آنکھوں میں ایک زہرناک شکایت، اور غم افزا بغاوت۔ کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں۔ کوٹ پُرانا ہوتا گیا۔ زندگی پرانی ہوتی گئی۔ اس کی بیوی پرانی ہوتی گئی۔ اس کی آرزوئیں، خواہشیں، تمنائیں، جو اس روئیں اور کوٹ کی طرح گدیلی اور لذت کوش تھیں، سب اڑ گئیں۔ کوٹ کے اُڑتے ہوئے روئیں کی طرح۔ زندگی ایک اجاڑ ویران کھنڈ سے بلند و بالا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ تسکین، آسودگی اور حیداری کا کہیں وجود نہ تھا۔ بالکل چٹیل میدان۔ تصور اور تخیئلی جذبات کی ساری سرشگفیاں وقت کی آتش زنی کی نظر ہو چکی تھی۔ کڑی کڑی باتیں، سخت گوش آوازیں —— کوئی حد تھی، اور اب صرف ایک ہی تصور اس کے دماغ میں تخیل سکھا رہا تھا۔ کس طرح زندگی کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ موت کی گود میں کیسے پناہ ملیگی؟ مہینے کی آخری تاریخوں میں تو یہ تصور اتنا قریب، اتنا حسین، اتنا سچا اور اتنا حادی نظر آتا کہ اس کا جی بڑھ کر اسے چھو لینے کو، چمٹ جانے کو چاہتا مگر ———؟

اس وقت بھی وہ اس تیزابی تصور سے بہت قریب ہوگیا تھا۔ موت کا لمس اسے سہلا رہا تھا۔ اور کسی خطرناک دباؤ کی سانسیں نغموں کے جنگلی آہنگ کے ساتھ اس کی پیشانی پر جھوم رہی تھیں۔

وہ گھر سے باہر نکل گیا، —— چپ سادھے!۔

اس کی جیب میں پیسے تھے، روپئے۔ ساری کی ساری ریزگاریاں تھیں۔ چار روپئے۔ اس کے ساتھی مہندر نے یہ پیسے اس لئے دیئے تھے کہ وہ ایک روز انڈے کا حلوا بنوا کر اسے کھلائے۔ اس کی بیوی بہترین حلوا بناتی تھی مہندر کی بیوی اتنی گستاخ اور رعب داب والی تھی کہ اس سے فرمائش کرنا فوجی پیادہ کی ناک پر سے مکھی اڑانے کے برابر تھا۔ مات اس کے اور بیوی کے درمیان اتنی سنگین جنگ چھڑ گئی تھی کہ اس کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ حلوے کا مسئلہ بیچ میں لا کھڑا کرے، اور مہندر کے چار روپئے مفت میں اس کی جیب میں پڑے پڑے خراٹے لے رہے تھے۔

اس کے تیز تیز قدم اسے بازار کی طرف کھینچے لئے جا رہے تھے۔ سامنے ہی ایک انگریز کی کوٹھی تھی۔ اس کی

کوٹھی کو گھیرے ہوئے کافی بڑا احاطہ تھا۔ جس میں رنگ برنگ کے پھول اگائے گئے تھے اور یہاں سے وہاں تک گملوں کی قطاروں کو اتنے قرینے سے لگایا گیا تھا کہ بس دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا۔ شبنم پگھلی ہوئی چاندی کی طرح گھاس پر چمک رہی تھی۔ اس چھوٹی سی کوٹھی میں ایک انگریز رہتا تھا، اس کی میم تھی، بچے تھے، نوکر تھا، بیرا چپراسی اور مالی، جاڑے کے کپڑوں میں ڈوبے ہوئے وہ سویرے سویرے ٹہلنے نکلتے۔ ان کے بچے چھوٹی چھوٹی کالی گاڑیوں میں بیٹھ کر آیا کے ساتھ فرشتوں کی طرح مسکراتے پھرتے۔ اس نے دیکھا میم کی آنکھیں، بچوں اور پھولوں کو تول رہی تھیں۔ موازنہ ہو رہا تھا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہیں اس کا موازنہ وہ ڈیل ڈول والے لانبے تڑنگے صاحب سے نہ کرنے لگے —— تو وہ کہاں جا گریگا، کہاں؟ ۔ زمین کی انتڑیوں میں۔ اس کے ڈھانچے پر ایک میلا پاجامہ تھا، ایک ردی قمیص اور ردی کرتہ، جو کوٹ بھی تھا اور سات سال کی فراموش تاریخ بھی۔ وہ آگے بڑھ گیا——

اس کا دماغ یادوں سے بھر گیا تھا، حالانکہ ٹھنڈی ہوا کی قاشیں اس کے پھیپھڑے اور حلق میں اترتی جا رہی تھیں اس کے ہاتھ ٹھٹھر رہے تھے۔ اس نے اپنے پنجوں کو جیب میں چھپا لیا اور اس کی ٹھنڈی انگلیاں ٹھنڈی ریزگاری کو کریدنے لگیں۔ جو اس کے دوست کا حلوا تھیں، جو ابھی حلوا نہیں بنی تھیں، اس لئے کہ اس کی بیوی کا موڈ زلزلے میں تھا۔

لاریٹو کانونٹ——!

عیسائی مشن کی عورتیں۔ حوریں۔ فرشتوں کی مائیں بہنیں (وہ بیویاں نہیں ہو سکتی تھیں) —— وہ سفید فام چہروں اور بگلے جیسے کپڑوں کی وجہ سے بیحد تقدس مآب معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی زندگی کے خلا میں یہ موم کی مورتیں ناچنے لگیں، جو عبادت کی دلدادہ تھیں جو دوسروں کو گرجا کی طرف گھسیٹ کر لیجاتی تھیں اور جن کے ہونٹوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں رس نہیں، خون نہیں، گرمی نہیں، بس وہ دو زندہ ورق ہیں جو پھڑپھڑاتے ہیں تو بائبل کی آواز گونج کر فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے اور تھرکتے ہاتھوں میں خدا اور خدا کے بیٹے کا خوف لرزتا رہتا ہے ان کی نگاہیں کتنی روپہلی، کتنی گہری۔ آدمی ڈوبتا چلا جائے، پھر بھی جسم کو نہ پا سکے۔ روح اور روح کی گہرائی۔ گہرائی، جو جسم کے اندر بھی تھی اور جسم کے باہر بھی۔ ایک ظلمت پھیلتی ہوئی، جھومتی ہوئی، گاتی ہوئی، جو ہر چیز کو اپنے قدم پر سجدے میں گرا دیتی ہے اور جو چیز نہیں گرتی اس کو روند ڈالتی ہے۔ روح کی عظمت اور گہرائی، ان حدوں کو اپنے پرواز کا طلسم دکھاتی ہے ان نیلی آنکھوں کی کائنات، ان کا پندار، ان کا سحر، جس کے خلاف ہر بغاوت بوجھل۔ یہ عورتیں خدا کی خدمت میں اپنی عمر بتا دیتی ہیں، یہ شادیاں نہیں رچاتیں، عوام الناس کی خدمت کی شمع ان کے ہاتھوں میں روشن رہتی ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بولتیں سچ ان کا راستہ ہے، یہ انسانیت کو جنت کا راستہ بتاتی ہیں۔ یہ جب گرجا میں جاتی ہیں تو اپنے اندر کی طاقت میں جلتی ہوئی عورت کو سنکھیا کھلا دیتی ہیں اور صرف ایک پاکیزہ روح کا جنازہ بن کر وہ دوسروں کے لئے جلتی رہتی ہیں۔ جلتی رہتی ہیں اس لئے کہ دوسرے ٹھوکر نہ کھائیں اور جنت انھیں تھام لے، وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ انسانوں کو فردوس کی گود میں پھینک سکتی ہیں، ایک مسکراہٹ سے تاریکی پر روشنی کا غلاف ڈال سکتی ہیں، ایک اشارے سے آگ بجھا سکتی ہیں—— لیکن —— وہ اس کے جیسے لاغر کلرک کی بے بضاعتی، بے رنگی اور بے بسی کی پروا نہیں کر سکتیں۔ وہ اپنی آسودگی مسرت آفرینی اور سکون نظری سے اس پر طنز کئے بغیر نہیں گزر سکتیں——

ان کی مذہبی کتابوں میں یہ نہیں لکھا ہے کہ جب تم ایک ٹھٹھرتے ہوئے کمزور کلرک کو سڑک پر کانپتے ہوئے گزرتے دیکھو، تو اسے صرف دیکھو مت، اسے پیار سے پاس بلاؤ، محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکو جس کے اندر لاشوں اور بیماریوں کا ہجوم ہے —— اور ایک ایسی عبادت سکھاؤ، ایک ایسی عبادت، جس سے وہ کلرک رہتے ہوئے بھی انسان

—— باقی رہ سکے، جاڑے کی قینچیاں اسے بھینچ نہ سکیں۔ بچہ بجو کا اور دوا کے بغیر نہ مر سکے۔ بیوی اچھی ہونے کے باوجود بری معلوم نہ ہو۔ لیکن یہ سب ان سفید فام، موم سے بھی زیادہ نرم دل اور ہوا سے بھی زیادہ نازک اور مقدس موتیوں کی کام کی باتیں نہیں، وہ تو خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتی ہیں اور ان کا کام تو عیسیٰ مسیح کو خدا کا بیٹا ثابت کرنا ہے —— یہ تو ان کے سفید چہروں، گہری آنکھوں اور ٹھنڈی مسکراہٹوں سے آئے دن ثابت بھی ہوتا رہتا ہے —— !

وہ سوچتا جا رہا تھا۔ دماغی الجھن طویل ہو گیا تھا۔ لیکن راستہ کاٹنے کا یہ اچھا بہانہ تھا اور وہ اس کا عادی تھا۔ وہ کافی دور نکل گیا تھا۔ ٹاور اپنا چہرہ اپنے سارے پڑوسیوں سے بلند کئے ہوئے تھا۔ وہیں پر کافی ہاؤس تھا۔ وہ اب تک پیسوں کو ٹٹول رہا تھا۔ چار روپئے۔ اس کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کبھی کسی انگریزی ہوٹل میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ ہوٹل میں جا کر کیک، پیسٹری، ٹوسٹ، آملیٹ، چکن کری، رائس کا ذائقہ چکھ سکتا تھا۔ مہندر ان خدائی نعمتوں کا تذکرہ بڑے جوش و خروش سے کیا کرتا تھا اور اس وقت وہ کہتا "ارے چھوڑو یار، ایک رٹ لگا رکھی ہے —— تو تو میاں مٹھو بن جاتا ہے —— بس پیر فقیر اٹھا بستر چل مکہ زیارت کو۔ نبی جی روزی بھیجو —— یہ بھی کوئی تک ہے۔ رہ جاؤ ایک ہی بات۔ میاں کوئی کام کی نئی بات کہو تو ایک بات بھی ہے —— ہاں" جیسے یہ ساری چیزیں اس کے لئے جانی پہچانی کیا، بالکل اوڑھنا بچھونا تھیں، لیکن اس وقت یہ سوال بار بار اس کو تنے پر مکا رسید کر رہا تھا —— کیوں نہیں؟ مہندر کے روپئے؟ وہ بے بس ہو گیا خبطی جیسا بدحواس۔ اس نے پھر پیسوں کو کرید کر دیکھا، وہ موجود تھے، اس کے پاؤں اکھڑے اکھڑے، ڈھیلے ڈھیلے سے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ "ریپن بار" میں داخل ہو چکا تھا۔

وہاں کی فضا اسے عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک گہری اٹھتی ہوئی لہر نے اسے بڑھ کر جکڑ لیا ہے۔ سر سے پاؤں تک۔ وہ ایک کرسی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیرا مسکرایا، لپکا، اور بڑی ہمدردی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی پھڑکتی ہوئی مونچھیں جیسے کہہ رہی تھیں —— "ادھر کہاں مر رہے ہو، وہ سامنے ہی تو بقاتی کی دکان ہے۔ سوجھتا نہیں، بنچیں ہیں، ٹیبل ہے، جس پر شوربے اور چائے کے بیشمار دھبے جگمگاتے رہتے ہیں۔ وہاں چائے بھی ملتی ہے، گرم گرم سینکی ہوئی تنوری روٹیاں بھی، اور اس وقت نہاری بھی ملے گی"

"جی صاحب ——؟" اس کے سامنے طنزیہ سوالیہ نشان کھڑا تھا۔

"ہاں ——"

"کیا لایا جائے؟"

"جو تمہارا جی چاہے ——"

"جی ——؟"

"ہاں، جو تمہارا جی چاہے، —— یہی پیسٹری، آملیٹ، کیک، اور جو تمہارا جی چاہے ——"

"پیسٹری، آملیٹ، کیک ——"

"ہاں، ہاں لے آؤ ——" وہ اپنا سر کھجلانے لگا۔

چاروں طرف کمرے میں ننھی کرسیاں اور رنگین میزیں بڑی احتیاط اور خوبصورتی سے رکھی گئی تھیں۔ سامنے ایک بڑی سی گھڑی چاروں شانے چت کراہ رہی تھی۔ بیرے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ منیجر کے پاس ہی کچھ کھانے کی لذیذ چیزیں بڑی نزاکت سے سجی گئی تھیں۔ ہوٹل کی اس آرائش و جمال کی کہانیاں تو بہت سنی تھیں، دور سے دیکھی بھی تھیں، لیکن اس کو نظر ملا کر، اس میں بیٹھ کر، منہ چڑانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ نزاکت، زیبائش، قرینہ، شیشے کے فانوس، صندلی الماریاں اور

ایک انگریز کی انگلی اور لکھنوی متھنیاں جھنک رہی تھیں۔ رنگین رنگین، سادہ سادہ، رنگ برنگ کی تتلیوں کو جیسے پکڑ کر ان میں بند کر دیا گیا تھا۔ ایک ملا جلا خوشبو دار رقص کر رہی تھی۔ اس خوشبو میں، اور پر دلداری ہونٹوں کے سوندھے پن میں بالکل ایک کلرک اور سیٹھ رامچندر رام کا فرق تھا۔

ٹھیک دروازے ہی کے سامنے ایک قد آدم آئینہ سینہ چمکا رہا تھا۔ ہر اندر داخل ہونیوالا آدمی اپنی چھب آئینے میں دیکھ کر خوش ہو جاتا جیسے آئینے نے چیخ کر کہا ہو — کیا کہنے ہیں جناب! بعض ایسے بھی آئے جنہیں اپنی خوبصورتی ایک ذرہ نہ بھاتی۔ منہ ان کا کڑوا ہو جاتا۔ ان کے چڑھے ہوئے تیور میں نفرت جھٹک کر کھڑی ہو جاتی، جیسے اس نفیس قد آدم آئینے نے کہہ دیا ہو "پرے ہٹو، اور یہ ہوٹل"۔ لڑکیاں نرم نرم، حسین، دلفریب، لیکن تنہا، اور کہیں ایک ہی شعر کے دو مصرعوں کی طرح میزوں کے آر پار آمنے سامنے، وہ کھاتا جا رہا تھا۔ سبز دیوار پر کلنڈر، اور عریاں، نیم عریاں، اور ہیجانی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس شاندار ہوٹل میں بھی، دو تین دیوتاؤں کی تصویریں تھیں۔ دیویوں کے برف وش جسم، متعدد ہاتھ، بطخ پر سوار، کنول کے پھول، ہاتھی کا سونڈ، مورتیں اور ہنومان، نہ جانے تقدیس، اور ان چیزوں کا کیا جوڑ تھا۔ اس نے پورا ایک ڈالتوں میں دبا لیا۔ وہ کھاتا جا رہا تھا۔ اس کی ذہن کے ساتھ اس کی رگوں میں بھی کھلبلی رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں ایک بھوک، ایک امنگ، ایک بھیک کی غیر محسوس تلاش کانپ رہی تھی۔ نہ جانے اس میں چھچھوراپن بھی تھا یا نہیں۔

وہ پارسی لڑکی داخل ہوتے ہی، برق بن کر سب کی نگاہوں پر جیسے گر گئی۔ اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ ٹھہری، رکی، پھر سر جھٹک کر ایک میز کی طرف بڑھی۔ وہ بہت حسین تھی۔ اس ہوٹل میں اس سے زیادہ مکمل عورت اور کوئی دوسری نہ تھی۔ اس کی چوٹیاں دو برابر حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ جڑیں ان کا ایک ہی مرکز تھا۔ ایک سانپ آگے جھول رہا تھا اور دوسرا پشت پر۔ اس کا جی چاہا، کاش یہ سانپ پھن پھیلا کر اس پر جھپٹے، اس کو ڈس لے۔ اس کا زہر اس کی رگ رگ میں گھل جائے۔

اسے کسی کا انتظار تھا۔ اس نے کبھی اپنی بیوی کو بھی اسی طرح اپنے تصور میں بے قرار پایا تھا ——— لیکن اس کے پاس ایسے سانپ نہ تھے جن کی خوشبو پھن پھیلا کر ڈستی پھرتی ہو۔ ایسی ساری، ایسے سینڈل، ایسے بارڈر، لپ اسٹک، نیل پینٹ، چشمہ، اور سونے کی کڑیاں، زمرد کی ایرنگ یہ سب کچھ اس کے پاس کہاں تھا۔ اسے اپنی بیوی کا خیال بے محل سا معلوم ہوا۔ اس لئے اس نے ہر ممکن کوشش سے اس کی شکل، کانپتی ہوئی کلپنیوں کو زبردستی اپنے تصور کی سرحد سے باہر ڈھکیل دیا ———

یہاں اس کا کیا کام تھا۔ اس کے پاس ہزاروں روپئے تھے۔ ہال میں پیرا چکر لگا رہا تھا، نگاہیں ناچ رہی تھیں۔ پارسی چھوکری تھی اور بھی لڑکیاں تھیں، مگر اس کے مقابلے میں وہ کمزور تھیں۔ نسخ ہونے کے باوجود ان کے حملوں میں ضرب کا وہ دیوانہ اثر تھا۔ وہ تو ——— "بقدر پیمانۂ تخیل" اپنے دل میں سودا کی تو ضرور جگا رہی تھیں، لیکن اس کے سامنے، پٹرولنس اور طوائف کے پیشے کی بے حجابی کا فرق رکھتی تھیں۔

وہ چلبلی، خوبصورت، حسین، جگمگاتی ہوئی شاخ برق ساماں تھی۔

وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔

وہ اسے کھا رہا تھا۔

اس لئے کہ وہ رتن بازار میں تھی۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ اسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔

وہ اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن سات سال کی تاریخ اسے روک رہی تھی جس کا رواں ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے پاس ہزار کے روپئے تھے اور ان پر اس کا قبضہ تھا۔

دروازے میں ایک لمبا خوش پوش نوجوان داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان ایک سگار تھا۔ وہ چلبلی پارسی لڑکی

چونک کر اٹھی۔ اس کے رخساروں پر خون کی تالیاں منجمد ہو گئیں۔

منیجر اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے لوہے کے ٹرے میں نوٹ کے پلندے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی پاس کے روپئے بل پر خرچ ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ چندہ کرتے پھر رہے تھے، وہ کالج کے لڑکے تھے "فریڈم، پیس، پروگریس" ایک موہوم امید، کشمکش اور جدوجہد پر چلنے کا نعرہ۔ صرف نعرہ۔ لیکن ملا کیا؟ قربانیاں تو ہوئیں۔ کلکتہ، کراچی، بمبئی، د کے نئے انقلابی گھن گرج نے کیا دیا؟ کیبنٹ مشن ہی نا؟ وہ تو ۴۲ میں بھی آیا تھا ——— ذرا دیکھو تو، کہتے ہیں، انھیں بنگال اور بہار سے ہمدردی ہے۔ جہاں انسان نے انسان کا گلا کاٹ کر انسانیت کو مار دیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں انسان کے خول میں درندوں کی روح رکھنے والے انسانوں کی کارگزاریاں غیر فانی ہو گئی تھیں۔ ان کے چہروں پر اپنے ہی طمانچوں کے نشان تھے۔ اسے ان لوگوں سے ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے پاس جو پیسے بچ رہے تھے ان سے اس نے سگریٹ خرید لی۔ اس کا خیال تھا، خودکشی عام ہو گئی ہے، اس لئے گناہ نہیں۔ نواکھالی اور بہار میں انسانوں نے انسانوں کو مارا۔ انسانیت نے خودکشی کی۔ میں بھی خودکشی کر سکتا ہوں اور خودکشی کرنی پڑے گی۔ وہ جب ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کے ذہن کے پس منظر میں وہ حسین مورتیں چکر کھا رہی تھیں۔ لیکن ان دھندلکوں کی تہہ میں صرف ایک سوال ابھر رہا تھا۔ مہندر کا روپیہ؟
— آخر مہندر کا روپیہ کس طرح ادا ہوگا؟ لیکن کوئی بات نہیں۔ تین روز میں تنخواہ مل جائیگی۔ اس نے اپنے دل کی تمنائیں پوری کر لی تھیں۔ آملیٹ، پیسٹری ——— اور ——— اور یہ کوئی معمولی بات تھی کیا؟ لیکن نینو بیمار تھا، بیوی کی کہنیاں ننگی تھیں۔ اس کے کمرے میں گندگی تھی۔ اس کی زندگی کو دیمک چاٹ رہی تھی۔ آخر کب تک اس طرح گذارا ہوگا۔ کب تک بغیر کپڑے اور راشن کے آدمی جی سکیگا، اور اس پر مہندر کے روپئے وبال بن گئے تھے۔ اب اس کے جوش کی اترتی ہوئی ترنگ نے تلخ احساس کی لو اوپر اٹھا دی، جو اس کے دماغ کو جھلسانے لگی، اور دھواں ہی دھواں اس کی نگاہوں پر چھا گیا۔ اس کی ناک کی باریک گلیوں میں محسوس اکتاہٹ رینگنے لگی۔ دماغ کے اوپری گنبد میں چنڈول بولنے لگا۔ اور ادھر دھڑکنوں کی ناؤ سینے میں ہچکولے کھانے لگی۔

اس نے ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر بجلی پیدا کی اور دہکتی بجلی چمکا۔ یا تھکتی جسم کی نس نس میں کوند گئی۔ بجلی کے تار سڑکوں پر، یہاں سے وہاں تک مسلسل اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ برقی ستون پر سفید قلفیاں اوندھی ہوئی تھیں اور کالے کالے تار دانتوں میں جکڑے ہوئے تھے، اور تاروں کے تناؤ پر اوس کی بوندیں تلوار کی دھار کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنی جیب کی اجڑی ہوئی دنیا میں اپنے ہاتھوں کو گھسیڑ لیا۔ اس میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی، جیب کے اندر بھی ٹھنڈک اور باہر بھی۔ پھر ایک بار مہندر کے روپے کے تقاضے کی یاد نے اس کے رونگٹوں کو سہما دیا۔ کیا ہوگا؟ باتونی تو وہ خود ہے پلے درجے کا۔ باتوں میں آنے سے رہا۔ کیا جواب دوں گا؟ ——— اور پھر اچانک، خود، موت، تنہائی۔ ان پہیلیوں میں کیا رکھا ہے۔ گندی الجھن، نہیں، نہیں ——— آدمیت تو سنبھلنے کا نام ہے۔ طوفان میں، دھکے میں، چوٹ سے خوف کھا کر آدمی کا خود اپنے آپ سے دور بھاگنا، رسوائی اور ذلت کی بات ہے۔ ان نیزوں کا مقابلہ کرو جو چھاتی کو تاک رہے ہیں۔ یہی ایک زندگی کا راستہ ہے۔ بھاگ، فرار، چھلانگ، ——— کھسیاہٹ ہے، بزدلی ہے، زندگی نہیں۔ موت ہے موت، موت ایسی جو موت بھی نہیں، بس ایک خلا، جس کا مستقبل نہ ماضی۔ آگے پیچھے کھوکھلا پن اور کچھ نہیں۔ زندگی کی اذیتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مر جانا زندگی ہے۔ خودکشی موت ہے۔ صرف موت، جسے زندگی سے لڑنا نہیں پڑا۔

سامنے بینک کا اونچا محل ابھی خالی زمین کی چھاتی پر اٹھا منہ پڑا تھا۔ اس عمارت کا نک نقشہ ہی بہت ڈراؤنا

سُرخ اینٹوں سے بنا ہوا ڈھانچہ۔ کوئی پالش اور چکناہٹ نہیں۔ ساری رنگینی ان روپوں میں تھی، جو اس کے اندر پرواز کرتے رہتے۔ لڑھکتے رہتے ـــ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں۔ سات سال سے وہ اس بینک میں کلرک تھا۔ اس کی شادی اور نوکری کی عمر برابر تھی۔ اس کی شادی کو تین بچے پیدا ہو چکے تھے، اور اس کی نوکری کو کوئی بچہ پیدا نہ ہوسکا اس کی تنخواہ بانجھ تھی بانجھ۔ آغاز میں اسے کتنا مزا آیا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ بینک کی کمائی سے اپنی بیوی کے لیے چپل خریدی تھی۔ سُرخ۔ آسمانی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے نشوں کا آٹا لگنے لگا، اور وہ رنگینوں کا مقبرہ تھا۔ آرزوؤں کی ٹہنیوں پر اُلوؤں کا گھونسلہ بن گیا۔ طبیعت کی جولانی افیون کی گولیاں پھانک گئی ـ بچے کچے۔ پیشاب کی کھرانٹ۔ پھلیوں کا انبار۔ گرم کوٹ کی سات سالہ تاریخ، بیوی کی چڑچڑاہٹ، اس کی ننگی کہنیاں، بچوں کی تپتی ہوئی پیشانیاں، چودہ روپیے کی سینڈل، مغل کی لاٹھی، مہندر کے پانچ روپیے؟ ـــــــ آخر کیا کرے؟۔

کلرک کی زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ رمیش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تمام ہڑتالیں چلنے لگیں۔ ننگی عورتوں کے مظاہرے ہوئے۔ قومی حکومتیں طلوع ہوگئیں۔ لیکن زندگی افق کے زہریلے تاریک کھڈ اور ڈراؤنے غار سے نہیں اُبھری۔ آسودگی، طمانیت اور مسکراہٹ جنم نہ لے سکی۔ رمیش عاجز آکر ایک روز اپنی بیوی کی ساری باندھ کر، آفس چلا گیا۔ لوگ ہنسے ٹھٹھا کے لگے، آتش بازیاں چھوٹیں۔ لیکن اس نے اپنے اونچے عہدے والے حکمراں کی ڈانٹ کی پروا نہیں کی۔ اس نے کہا: "کپڑا نہیں ملتا ہے۔ گھر میں ایک ساری ہے، بیوی بھی پہنتی ہے اور میں بھی۔ اب میں پہن کر چلا آیا ہوں، وہ صرف پیٹی کوٹ پہنے گھر میں بیٹھی ہے۔ جب تک میں واپس نہ جاؤں، تو یہ نہیں باندھوں، وہ دروازہ نہیں کھول سکتی" اور پھر قہقہوں کا بیلون پھٹ پڑا تھا۔ پھٹ ک پھٹاک۔ ہی ہی ہی ـــــ! اگیہ ڈر کے گیت اور سبھوں کے دل میں چولہے کی آنچ تیز ہوگئی تھی۔

اور بینک کی گھڑی نے سامنے ساڑھے دس کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ گہری سردی کے باوجود پسینے کی چپچپاتی ہوئی نمی، اس کے جسم پر مچل گئی۔ اس کا منیجر اس سے پہلے آگیا تھا۔ اس نے اس کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سہم گیا۔ اور سوکھتے ہوئے حلق کے ساتھ دربان کی بندوق کے پاس سیڑھی پر چڑھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے بھی اس کے کابلی سینڈل نے اپنی تشریف آوری کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کر دیا۔

"کیوں ـــــ فائل کا کام ہوا؟"

"حضور ـــــ"

"حضور کہتے ہیں تم سے کام نہیں ہوتا تو جواب لے لو؟"

"کام تو ہوتا ہے حضور"

"کہاں ہوتا ہے، لاؤ فائل"

"وہ تو، وہ تو، غلطی سے گھر پر ہی رہ گیا، ننھے کی دوا جولانی تھی ـــــ اور دیکھئے"

"بکو مت ـــ ایک گھنٹے میں پھر آنا، تمھیں آج سمجھ لوں گا"

"لیکن ـــــ" اس کی آواز تھوک کا بڑا ڈھیلا بن کر حلق میں پھنس گئی۔

وہ فائلوں کی جھرمٹ میں آکر اپنی کرسی پر آکر دھم سے گر گیا۔ جیسے اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئی ہوں۔ اس نے یونہی غیر ارادی طور پر، کنارے کی کرسی پر نظر ڈالی، مہندر للچائی ہوئی چھچھوری نظروں سے، اسے گھور رہا تھا، وہ لرز گیا جیسے اس کی نگاہیں، حوصلے کے تقاضے کی تاک میں تھیں۔ نوٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ روپیے بج رہے تھے، دفتری دوڑ رہا تھا، کاؤنٹر پر بھیڑ تھی۔ وہ ساکت، خموش اور نڈھال برقی پنکھے کو تکنے لگا، جو ٹھیک اس کے سر پر ڈینوں کو

پروین رشدی

بازگشت

یہ افسانہ مشہور مرہٹی ادیب وی۔ ایس کھانڈیکر کی تازہ ترین ناول کا مخص ہے جسے جدید مرہٹی ادب کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ کھانڈیکر نے متعدد ناولیں، مضامین اور فلمی کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کی کئی کتابیں تامل، کنڑی اور گجراتی میں ترجمہ ہو چکی ہیں ـــــــــ اس کا اسٹائل سادہ، پاکیزہ اور دلکش ہے۔ اسکی تکنیک بے عیب ہے اور تخیلات میں بلند پروازی پائی جاتی ہے۔

صبح سے سلوچنا غائب تھی، اس کا بوڑھا باپ پروفیسر دادا صاحب بہت حیران و پریشان تھا۔ اس کی نظر ردی کی ٹوکری پر پڑی، جو کاغذ کے ٹکڑوں سے بھری تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ رات بھر کہانی لکھتی رہی ہوگی، جس کا اس نے ذکر کیا تھا اور اب تھک کر باہر گھومنے چلی گئی ہے۔ ویسے ہی اس نے ٹوکری میں سے چند کاغذ کے پرزے اٹھائے، ایک ٹکڑے پر لکھا تھا "پیارے دلیپ" ـــــــ یہ کہانی کا ہیرو ہوگا۔ اس نے اندازہ لگایا اور شاید ہیروئن نے اسے کوئی خط لکھا ہوگا .... چائے پینے کے بعد وہ آج کے لیکچر کی تیاری کے لئے اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے بادا بھوتی کی "اُتر رام چریتا" کے ایک صفحہ کے شلوک پر سرخ نشان لگا یا تھا، جس کا مفہوم تھا " درخت پر پرندوں کا ایک جوڑا میٹھا پیار، محبت کر رہا تھا، اتفاق سے ایک بھیل شکاری ادھر آنکلا اور اس نے نر کو مار ڈالا۔ مادہ کی آہ و بکا سے متاثر ہو کر اس کو بھی تیر کا نشانہ بنا دیا، اسی وقت مشہور رشی والمکی، جنھیں پرندوں سے بڑی ہمدردی تھی، نمودار ہوئے اور بھیل کو برا بھلا کہا "وحشی تجھ کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوگی"۔ اخبار والے کی آواز سنکر دادا صاحب کے خیالات ایکدم منتشر ہو گئے "مجرم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا"

"پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا؟" دادا صاحب نے کہا۔ "کسے پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے کوئی محب وطن ہے یا صرف مجرم ...." کالج کا وقت ہو گیا تھا، چنانچہ وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ کالج میں آج بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ اسے پرنسپل سے معلوم ہوا کہ لڑکے کالج بند کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پرانے ساتھی ڈنکر سارڈیسائی کو رام گڈھ کی عدالت نے اس بنا پر سزائے موت دی ہے کہ "اسنے کسانوں کے ایک ہجوم کو تشدد پر آمادہ کیا جس سے ایک کانسٹبل ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے" "ڈنکر!" دادا صاحب نے تعجب اور گھبراہٹ سے کہا۔ "ہاں!" پرنسپل نے جواب دیا "یہ وہی لڑکا ہے جس کی آپ نے چار سال تک حمایت کی تھی، کاش یہ خود بیں لڑکا سیاست میں نہ الجھتا، خیر" اسنے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "رام گڈھ کے راجہ صاحب

(بقیہ صفحہ ۲۸) پھندے لٹکا ہوا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا، اس کی آنکھیں پنکھے کے درمیانی لٹو پر جمی ہوئی تھیں، یکایک اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں، پنکھا زوروں میں چکر کھانے لگا، گھن، گھن تنگی کہنیاں، ہانپتی ہوئی کم سن سانسیں ھنھنہ، بیک، مینیجر، پنکھن جنون میں تھا۔ اسے گرمی لگ رہی تھی، اس کے جسم کو چنگاریاں نوچ رہی تھیں۔ اس کی پلکوں کا غلاف صندوق کے بھاری ڈھکنے کی طرح گر گیا، ـــــــ

"صاحب بلاتا ہے" دفتری جھنجھوڑ کر واپس چلا گیا۔

کالج بورڈ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں چنانچہ ہم اُن کے دشمن کی ہمدردی میں کالج بند نہیں کر سکتے ۔۔۔۔۔"

دادا صاحب جب کلاس میں داخل ہوا تو وہاں صرف چار پانچ لڑکے موجود تھے۔ اس نے باوا بھوتی کے شلوک سے لیکچر کا آغاز کیا، مگر اُس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں اور اُس کے سامنے یہ نقشہ پھر گیا کہ ڈنکر اور سلوچنا پرندوں کی شکل میں بیٹھے محبت کر رہے ہیں۔ اور وہ بھیل کی حیثیت سے درخت کے نیچے کھڑا ہے، سراسیمہ ہو کر اُس نے لیکچر ختم کر دیا اور کالج سے چلا گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو سلو ابھی تک نہیں آئی تھی، پروفیسر نے خیال کیا کہ کہیں جذباتی سلو اچانک اپنے شوہر ـــ رامگڈھ کے مشہور سرجن ڈاکٹر بھگونت راؤ سہانے کے پاس تو واپس نہیں چلی گئی؟

تو پھر اُس نے ڈاکٹر کو تار ضرور دیا ہوگا، وہ تیزی سے پوسٹ آفس پہنچا کہ شاید اسے وہاں کوئی تار مل جائے، لیکن تار کے بجائے اُسے وہاں ایک لفافہ ملا۔ اس نے بیتابی کے ساتھ لفافہ کھولا تو اُس میں ایک کنجی نکلی، اور ایک کاغذ کی چٹ پر لکھا تھا "آپ کا اور بھگونت راؤ کا مجھے تلاش کرنا بے سود ہے، یہ میرے دراز کی کنجی ہے" اچھا تو وہ اس کے پاس بھی نہیں گئی پھر؟ ۔ اسے سکتہ سا آ گیا وہ سیدھا گھر پہنچا اور دراز کھولی تو اُس میں ایک نوٹ بک نکلی، جس کے پہلے ہی صفحے پہ لکھا تھا "یہ میرا افسانۂ حیات ہے جسے میں لکھتی رہی ہوں" دادا صاحب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑے اشتیاق کے ساتھ ورق گردانی شروع کر دی ۔

اب سے پندرہ سال پہلے پتاجی جب ہمارے گھر غریب اور ذہین لڑکے ڈنکر سارڈیسائی کو کالج کی تعلیم کے لئے رامگڈھ لائے، اور اُس کو گریجویٹ ہونے میں مدد دی تو مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ وہ میری زندگی کا ایک اہم عنصر بن جائیگا، لیکن پہلے ہی روز میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اسے برسہا برس سے جانتی ہوں، اور ہم جلد ہی "ایک شاخ کے دو پھل بن گئے" وہ مجھے سنسکرت پڑھایا کرتا تھا۔ ہم نے ایک سبق میں ایک بہادر مگر رحمدل راجہ دلیپ کا ذکر پڑھا، اُس کی رانی کا نام سلوچنا تھا۔ سلوچنا اور دلیپ، اس ہم آہنگی کا مجھ پر بڑا اثر پڑا۔ اسی دن سے میں نے ڈنکر کو دلیپ کہنا شروع کر دیا۔ ایک سال گذر گیا۔ اس کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جا رہا ہے، میں نے کہا میں بھی چلونگی۔

"مگر محترمہ! آپ کو میری ماں کے گھر کا مطلب بھی معلوم ہے؟" ۔ "نہیں تو"

"جیل ہے" دلیپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

خیر تو وہ چلا گیا، ایک ماہ کے بعد واپس آیا اور مجھ سے کہا کہ وہ نمک ستیہ گرہ میں شامل ہونے گیا تھا، جو بدقسمتی سے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی ۔ بہر حال وہ کچھ نمک ضرور لے آیا جو آخری گرفتار شدہ دستہ چھوڑ گیا تھا، مجھے پیش کرتے ہوئے اُس نے کہا، "سلو اسکو سنبھال کر رکھنا"۔

ایک سال اور بیت گیا، اس نے انٹر پاس کر لیا۔ پتاجی کو بہت افسوس ہوا کہ وہ معمولی ڈویزن میں پاس ہوا۔ اور اسی لئے وہ اس کو سیاسیات سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے ڈنکر کو جتا دیا کہ وہ کم از کم بی اے میں اس کی تلافی ضرور کرے، ورنہ وہ صرف ایک معمولی اسکول ماسٹر بن کر رہ جائیگا۔

دلیپ خاموشی سے سنتا رہا، صرف میں جانتی تھی کہ اس خاموشی کا مطلب ہے: یہاں کسے پرواہ ہے، میرا پہلا فرض اپنے دیس کی سیوا کرنا ہے؟ ۔ دلیپ نے بی اے کے پہلے سال میں زیادہ ترقی نہیں کی موسم خزاں کی تعطیلات میں، وہ اپنی بیمار ماں کو دیکھنے چلا گیا۔ وہاں سے ایک ماہ بعد اس نے لکھا "سلو میں ایک سال کے لئے جیل جا رہا ہوں،" اس زمانے میں میں میٹرک میں تھی، میں نے دل لگا کر محنت کی اور فرسٹ ـــ پاس ہوئی۔

رہائی کے بعد دلیپ واپس آیا اور پتا جی کی مدد سے بی اے فائنل کا امتحان دیا۔ مگر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ پتا جی کی بات سچ نکلی، دلیپ رامگڈھ میں پچیس روپیہ کا اسکول ماسٹر بن گیا۔ اسی سال میں انٹر کے پہلے سال میں فرسٹ پاس ہوئی اوہ! میں اپنے آپ کو کتنا مغرور ـــــ سمجھ رہی تھی۔ ایک سال اور بیت گیا، میرا انٹر فائنل ختم ہو چکا تھا، ان ہی دنوں دلیپ اتفاق سے ہمارے یہاں آیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ چلا آیا تھا اور اب ایک سنیاسی کے بھیس میں شمالی ہند کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ میں نے بی، اے کی تعلیم میں اپنے کو بیحد منہمک کر لیا تا کہ اس کو بھلا دوں۔ اب میں عالم شباب میں تھی اور مجھ پر لوگوں کی نظریں پڑنے لگی تھیں۔ کاش دلیپ بھی مجھے دیکھ سکتا۔ لیکن وہ کہاں؟ فوراً ہی یہ خیال آجاتا "میرا اس سے واسطہ؟ وہ ٹھہرا ایک معمولی پچیس روپیہ کا ماسٹر اور پھر سنیاسی میرا اس کا کیا جوڑ! اس کا راستہ مشرق، میرا مغرب، تو پھر میرا مطمح نظر کون ہے ـــــ کون ہے" میں اس کا جواب پا سکی

ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ پتا جی کے کالج کا پرنسپل چاہتا ہے کہ میں کالج کی سالانہ تقریب کی صدارت کروں ـــــ مقصد یہ تھا کہ ایک عورت کی صدارت میں تقریب میں حُسن اور دلکشی پیدا ہو جائیگی، جس سے متاثر ہو کر راجہ صاحب رامگڈھ شاید کالج کو کوئی شاندار عطیہ دے جائیں۔ میری اس دن کی تقریر "بہت کامیاب ہوئی"۔ راجہ صاحب نے میری بڑی تعریف کی اور ان کے خانگی ڈاکٹر بھگونت راؤ نے آگے بڑھ کر، مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کی گرم گرفت سے مجھے جھرجھری سی آگئی۔

ان دنوں پتا جی بیمار تھے، چنانچہ میں نے ڈاکٹر بھگونت راؤ کی موجودگی سے فائدہ اُٹھایا اور اُس سے علاج کے لئے مشورہ کیا، جلد ہی ہم ایک دوسرے سے شناسا ہو گئے۔ وہ اور میں اکثر بہت دور تک چہل قدمی کے لئے نکل جاتے۔ جب پتا جی اچھے ہو گئے اور بھگونت راؤ رامگڈھ جانے لگا تو میں نے اس سے فیس دریافت کی، وہ مسکرایا اور بولا: "مجھے سادہ چیک چاہئے"۔ "ٹھہریئے!" میں نے مذاق سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک اُس نے مجھے پیار کر لیا، "یہ ہے میری فیس" اس نے کہا۔ "چیک کا خالی حصہ اب بھر چکا" دوسرے ہی لمحے اس نے میری نظروں میں متشکرانہ جواب پا لیا ـــــ اس نے شادی کی تجویز پیش کر دی اور ہم منسوب ہو گئے ـــــ پتا جی کو بڑی خوشی ہوئی

بھگونت راؤ نے مجھ سے کہا کہ وہ راجہ صاحب کے ساتھ شمالی ہند کے دورے پر جا رہا ہے اور مجھ سے بھی چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں فوراً راضی ہو گئی۔ واپسی میں ہماری ٹرین جب ترا کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہری، مجھے ٹرین سے بہت سے سنیاسی اتر کر ایک قطار میں جاتے ہوئے نظر آئے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، ان میں دلیپ بھی تھا۔ میں چیخنا چاہتی تھی، مگر میری چیخ اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ گاڑی روانہ ہو گئی اور دلیپ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ میری زندگی بھی ـــــــــــــ

جب میں بھگونت راؤ سہلنے کی بیوی کی حیثیت سے رامگڈھ پہنچی تو میں اس کے بنگلے کے خوش منظر سواد سے بہت مسرور ہوئی۔ سامنے ایک جھیل تھی اور چاروں طرف نظر فریب منظر ـــــ! میں نے اوپر کے ایک مقفل کمرے کو رہنے کے لئے پسند کیا۔ میں اسے اپنی خوابگاہ بنانا چاہتی تھی۔ بھگونت راؤ نے میری تجویز کو پسند نہیں کیا، اور بے دلی کے ساتھ کنجیاں میرے حوالے کر دیں۔ جب میں نے خادمہ کو، اس ویران کمرے کو صاف کرنے کے لئے بلایا تو وہ بھی اُس کو خواب گاہ بننے کے حق میں نہ تھی۔ میری بہت پوچھ گچھ پر بھی اس نے کوئی سبب نہیں بتایا، وہ خواہ کچھ بھی ہو، بھوت ہو یا چڑیل۔ کیا ایک ڈاکٹر کی وہمی ہو سکتا ہے؟۔

خیر! اگر وہ ایسا ہے تو مجھے خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ کمرہ ہماری خواب گاہ بن گیا۔

چندماہ بعد بھگونت راؤ ایک دن کسی سرکاری کام سے دہلی چلا گیا۔ تنہائی سے اُکتا کر میں اکثر دلیپ کی بیمار ماں کے پاس ہو آیا کرتی تھی، ایک دن اس نے بتایا کہ دلیپ پُراسرار طریقے سے یہاں آنیوالا ہے۔ اسی دوران میں مجھے خبر ملی کہ پتا جی بیمار ہوگئے ہیں، میں جلد آنے کی امید میں رامگڈھ سے چلی گئی، ابھی مجھے پتا جی کے پاس آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ مجھے ایک تار ملا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ بھگونت راؤ دہلی سے آگیا ہے، میں رامگڈھ پھر واپس آگئی، گھر پہنچی تو وہ موجود نہیں تھا، وہ جیل گیا تھا چونکہ وہ جیلخانہ جات کا چیف سپرنٹنڈنٹ بھی تھا، اس کے سامان میں مجھے ایک کتاب "بھوتوں کی کہانیاں" نظر آئی مجھے اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے کئی جگہ سُرخ پینسل کے نشانات ملے۔ میں نے سوچا بھلا، ایک ڈاکٹر کو اس کتاب سے کیا کام۔ میں غصہ کی حالت میں فوراً جیل روانہ ہوئی۔ جیسے ہی میں اس کے دفتر کے دروازے پر پہنچی میں نے اندر ایک پہچانی ہوئی آواز سنی " ڈاکٹر صاحب جب تک کھانا اطمینان بخش نہیں دیا جائیگا قیدی اپنی بھوک ہڑتال ختم نہیں کریں گے " مجھے نفی میں اپنے خاوند کا سخت جواب سنائی دیا اور جلد ہی قیدی کو ہٹا دیا گیا میں نے اُس کو دیکھ لیا۔ افوہ! وہ دلیپ تھا، میرا سر چکرانے لگا ——— تھوڑی دیر بعد ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔

رات کے کھانے پر بھگونت راؤ نے بتایا کہ "دلیپ کس طریقہ سے چھپ کر رامگڈھ آیا اور کیسے اس کا پتہ چلایا گیا۔ گرفتاری کے بعد اسے جیل بھیجدیا گیا۔ یہاں اس نے فوراً ناقص غذا کی شکایت کی، اب وہ اور اُس کے ساتھی تین روز سے بھوک ہڑتال پر ہیں"۔ یہ سنکر میری آنکھیں چمک اُٹھیں، میرا بہادر دلیپ! ظلم و تشدد کے خلاف لڑنے والا مجاہد! اس رات میں نے اپنی ناز و ادا اور اس ضد سے، جسے صرف عورتیں ہی جانتی ہیں ——— اپنے خاوند کو قیدیوں کے مطالبات ماننے پر راضی کر لیا۔ اُن دنوں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں لرز اُٹھی، کیا لڑکا ہوگا؟ دلیپ کی طرح رحمدل اور بہادر، میں نے تہیّہ کر لیا کہ اس کا نام دلیپ رکھوں گی۔

چند روز بعد راجہ صاحب کی سالگرہ کے موقع پر تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اب میری توجہ ایک بار پھر اپنے خاوند کی طرف منعطف ہوگئی۔ دلیپ رہا ہو چکا تھا۔

دوسرے دن بھگونت راؤ اور میں "آرٹ ایگزیبیشن" دیکھنے گئے، دو تصاویر خاص طور پر بہت خوبصورت تھیں، ایک عمر خیام کی، جس پر فارسی میں ایک رباعی لکھی تھی، جس کا مفہوم یہ تھا "پیو، محبت کرو اور رنگ رلیاں مناؤ کہ شاید پھر کل نہ آئے" اور دوسری تصویر میں پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا، جس میں ایک بھیل شکاری جو نر کو مار چکا تھا، مادہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنا رہا تھا ایک عورت خون آلود، دم توڑتی ہوئی مادہ کو ہاتھ میں لئے تھی اور آنسو بہا رہی تھی اور مشہور رشی والمکی اپنا ہاتھ اُٹھا کر بھیل کو بددعا دے رہے تھے"۔ بھگونت راؤ نے پہلی تصویر کو پسند کیا اور میں نے دوسری۔ ٹھیک ہمارے نظریات میں ہی اختلاف تھا۔ آرٹ گیلری دیکھ کر ہم دروازے پر پہنچے تو وہاں دلیپ سے سامنا ہوا، وہ مسکرایا "کہئیے! نمائش دیکھی" میں نے پوچھا "آپ کو کونسی تصویر پسند آئی"

"مجھے تو پرندوں والی تصویر بہت اچھی معلوم ہوئی" ۔ "دیکھی؟" میں نے بھگونت راؤ سے کہا۔

"اکثریت میری طرف ہے" "مگر اکثریت ہمیشہ عقلمندوں کی نہیں ہوا کرتی ہے" اس نے فوراً جواب دیا "بہرحال میں اس کو تمھارے لئے خرید لوں گا" اور دوسرے دن وہ تصویر میرے کمرے میں تھی، کچھ روز بعد میرے ایک لڑکا ہوا، ——— صرف دس روز زندہ رہنے کے لئے، میری ملازمہ نے اس حادثہ کو "ممنوعہ کمرے" سے منسوب کیا۔

پھر اس نے ——— اس کا سبب بتایا، یہ ایک بڑے راز کا انکشاف تھا۔ راجہ صاحب کی ایک خوبصورت لڑکی اکا صاحبہ تھی، وہ اس کو اسی بنگلے (ہماری موجودہ خوابگاہ) میں الگ رکھتے تھے۔ تاکہ سوتیلی ماں سے، جو اُن کی موجودہ رانی تھی،

روز روز لڑائی جھگڑے نہ ہوں، یہاں اکا صاحبہ کو اپنے موسیقی کے استاد سے محبت ہو گئی، اور کچھ دن بعد حمل ٹھہر گیا، راجہ صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو وہ آگ بگولا ہو گئے، اکا صاحبہ نے التجا کی کہ اس کی شادی اُستاد سے کر دی جائے، مگر یہاں ہز ہائینس کے وقار کا سوال تھا، اس معاملہ کو چھپانے کے لئے راجہ صاحب نے استاد کو گرفتار کرا دیا اور پھر بھگونت راؤ کو حکم دیا کہ وہ لڑکی کے جنین کو آپریشن کے ذریعہ ضائع کر دے، تاکہ راجکماری کی دوشیزگی برقرار رہے! اس خطرناک آپریشن میں، جو اوپر کے کمرہ میں ہوا تھا، اکا صاحبہ جانبر نہ ہو سکی۔ اس کا آخری نظارہ اس قدر غمناک تھا کہ ڈاکٹر آج تک نہیں بھلا سکا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اس کمرہ سے کیوں گھبراتا ہے، اور اسے آسیبی کہانیوں سے کیوں دلچسپی ہے۔ لیکن اس نے ایسی وحشیانہ حرکت کیوں کی، میں نے اس سے جواب طلب کرنے کا تہیہ کیا۔

"لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا" اس نے جواب دیا "مجھے ہز ہائینس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی، میں ان کا خادم ہوں"

"لیکن غلام تو نہیں ہو" میں نے فوراً کہا۔ "تمھیں نہیں معلوم اُنھوں نے میرے لئے کیا کچھ کیا ہے"

"خواہ کچھ بھی سہی، تم اپنے عہدے سے استعفا دے کر دوسری جگہ ملازمت کر سکتے تھے اور ان کا قرض کو اتار سکتے تھے"

"ایسی حالت میں میری وہ حیثیت اور اقتدار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے میں تم جیسی لڑکی سے شادی کر سکا ہوں"

.... تلخ اشارات! لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہیں؟ کیا میں شادی سے قبل واقعی اس سے محبت کرتی تھی؟

ایک دن عام جلسے میں دلیپ کی تقریر ہونے والی تھی، میں بھی پہنچ گئی۔ تقریر نہایت سادہ اور اثر انگیز تھی، تقریر کے بعد طلباء نے "پیغام" کے لئے اس کو گھیر لیا، میں بھی اس کے پاس پہنچی "میرے لئے کوئی پیغام؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور یہ جملہ لکھ دیا "ماں بنو!"

وہ کتنا ستمگر تھا، حالانکہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ حال ہی میں میرا بچہ جاتا رہا ہے، میں نے اپنے پر قابو پا کر اس سے وضاحت چاہی تو اس نے جواب دیا "میرے ساتھ گاؤں چلو، تمھیں خود اس کا جواب وہاں مل جائیگا" دوسرے دن وہ مجھے گاؤں لے گیا، اور وہاں دیہاتیوں کے نکبت و افلاس کے دردناک مناظر دکھائے "ان لوگوں کی ماں بنو!" اس نے زور دیکر کہا۔

جب میں گھر واپس آئی تو میرا دماغ بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ چند روز بعد بھگونت راؤ راجہ صاحب کے ساتھ بمبئی چلا گیا اس دوران میں کالرہ وبا کی شکل میں سارے شہر میں پھیل گیا، دلیپ اور اس کے ساتھیوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے جان توڑ جد و جہد کی، میں بھی ان کے ساتھ ہو گئی، وبا پر قابو پا لیا گیا۔

جب بھگونت راؤ واپس آیا تو اس نے طنزاً مجھ سے پوچھا "معلوم ہوا ہے کہ محترمہ رضاکارانہ کام کر رہی تھیں"

"یقیناً" میں نے جواب دیا "مشہور ڈاکٹر بھگونت راؤ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے، جو راگ رنگ سے ایسے اہم وقت پر چلا گیا تھا جب کہ اس کی شدید ضرورت تھی"

"جی ہاں!" اس نے کہا "یہاں ٹھہرنے کے لئے میں عوام کا نوکر نہیں ہوں، میں راجہ صاحب کا ملازم ہوں اور جان من! تم یہ سب کچھ اس شوریدہ سر دلیپ کی خاطر کر رہی ہو، ورنہ تمھیں عوام سے کیا لگاؤ۔ اب یہ رنگ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا ——— سمجھیں" اور وہ تمکنت کے ساتھ چلا گیا۔

میں عوام کا نوکر نہیں ہوں ——— بھگونت راؤ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے، دلیپ اور اس میں کتنا فرق ہے؟ جلد ہی وہ بمبئی چلا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ قریب ہی کے گاؤں میں دلیپ ملیریا میں مبتلا ہے، چنانچہ میں اسے دیکھنے کے لئے گئی، گندے اور بد بو دار گھروں کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ شراب کے نشے میں شور و غل مچا رہے تھے، اور زور شور سے گالی گلوچ کا ہنگامہ برپا تھا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی، جب میں دلیپ سے ملی تو میں نے کہا خوب!

کیا یہی دیہاتی ہیں جنھیں آپ مثالی آدمی بنا رہے ہیں؟"

"آدمی پیدا نہیں ہوتے"، اس نے کہا "وہ بنائے جاتے ہیں، آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ وہ کس طرح بنائے جاتے ہیں" وہ مجھے ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں لے گیا، جو اس نے قائم کیا تھا۔ میں وہاں کے ننھے منے طلباء کے طور طریق، ضبط و نظم اور صفائی ستھرائی دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔

دیکھا تم نے!" دلیپ بولا "اسی طرح دوسروں کی بھی تربیت کی جائیگی"

میں اس کی جھونپڑی میں واپس آگئی، اس نے اپنی نقاہت کے باوجود مجھے گھر تک چھوڑنے پر اصرار کیا، وہ جانتا تھا کہ راستہ کا نالہ ہلکی سی بارش ہی سے باڑھ پر آجاتا ہے۔ جب میں نالے کو پار کر رہی تھی تو میرا پاؤں ڈگمگایا اور...... اور......
تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے کو دلیپ کی جھونپڑی میں پایا، اس نے مجھے بچا لیا تھا، اس روز مجھے وہیں ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ دلیپ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ مجھے دوبارہ نہیں لیجا سکتا تھا۔ دوسرے دن روانگی سے قبل میں نے اس کی تصویر مانگی، اپنی تصویر کے بجائے اس نے مجھے گاندھی جی کی ایک تصویر دے دی۔ گھر پہنچکر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بھگونت راؤ گذشتہ رات بمبئی سے واپس آگیا تھا "کہئے! آپ کے دلیپ صاحب کے کیسے مزاج ہیں"۔ اس نے طنزاً کہا "خوب!"
"تو محترمہ اس کی تصویر بھی لائی ہیں" یہ کہکر اس نے تصویر میرے ہاتھ سے چھین لی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی میں دوڑ کر اس کو اٹھا لائی اور اس کے منھ پر دے ماری، اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، لیکن ندامت نہیں..........
شام کو باہر جانے سے قبل اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں آج کسان سبھا کے جلسے میں جا رہی ہوں، جہاں دلیپ تقریر کرنے والا ہے جب میں نے کہا "نہیں" تو بولا کہ "یہ بہت اچھا ہے۔ کیونکہ میں تمھیں گولی کا نشانہ بنتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جلسے پر آج گولیوں کی بوچھار کی جائے گی ———— اور دلیپ ہلاک ہو جائے گا؟۔ میری نظر پرندوں کی تصویر پر پڑی، میں نے زخمی پرند کو غور سے دیکھا تو اس نے بتدریج دلیپ کی شکل اختیار کر لی اور روتی ہوئی عورت میں بن گئی! او خدا! میں نے فوراً دلیپ کو اطلاع دی "دل کا بہت سخت دورہ پڑ گیا فوراً آجاؤ" میں نے سوچا جب دلیپ آجائے گا تو میں اسے روک لوں گی، اس طرح وہ بچ جائیگا ———— اس وقت ہر لمحہ میرے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا ———— کہ اتنے میں نوکر نے دلیپ کے آنے کی خبر دی، میں ایکدم بستر پر بیمار بن کر پڑ گئی۔ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور وہ بتا رہا تھا کہ جو خط میں نے اسے بلانے کے لئے بھیجا تھا، وہ غلطی سے اپنی ماں کے تکیئے کے نیچے رکھ آیا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ بھگونت راؤ دروازے پر کھڑا ہے۔ میں گھبرا کر دلیپ کی آغوش میں گر پڑی اور بیہوش ہو گئی، جب ہوش آیا تو میرے پاس صرف دلیپ ہی تھا۔

"تم نے بغیر سوچے سمجھے اپنے کو میری آغوش میں گرا کر مجھے بڑی پریشانی میں ڈال دیا تھا ———— سنو!" اس نے مجھ سے کہا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔ میں اپنے خاوند کو اطلاع دیئے بغیر جلد ہی پتاجی کے گھر آگئی اور اس وقت سے میں یہیں ہوں۔ اس وقت میرے سامنے ایک تار رکھا ہے، جس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "عوام کو تشدد پر اکسانے کے الزام میں دلیپ کو پھانسی دیجائیگی"، یہ بالکل غلط ہے، جلسے کے وقت وہ میرے پاس تھا۔ بھگونت راؤ اس کو اچھی طرح جانتا ہے، لیکن اس نے عدالت میں اس کا اظہار نہیں کیا اور دلیپ نے عدالت میں اقبال جرم سے صاف انکار کر دیا ہے لیکن اس کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اگر میں عدالت میں سچائی بیان کر دوں تو کیا وہ بچ سکتا ہے؟ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟۔ کیا اس سے میری گھریلو زندگی تباہ نہ ہو جائے گی؟ پتاجی کے نام پر حرف آئیگا اور میرے بچے کا مستقبل برباد ہو جائیگا؟ اف وہ! دلیپ کے لئے کیا کروں؟ ———— کیا ———— ؟

دادا صاحب یہ کہانی پڑھ کر ششدر رہ گیا، اس نے پہلی ٹرین سے بالگڈھ جانے کا فیصلہ کر لیا، جب بھگونت راؤ کے گھر پہنچا تو ایک جوان عورت بھگونت راؤ کے کمرے میں موجود تھی، جو بظاہر بیوہ معلوم ہوتی تھی حالانکہ اسے علم تھا کہ اس کے داماد کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں ہے، جو اس سے اس قدر قریب ہو سکے۔

وہ کون ہے؟۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بھگونت راؤ نے اسے ایک سربمہر لفافہ یہ کہتے ہوئے دیا "یہ آپ کے لئے ہے" اور خود باہر چلا گیا۔ یہ ڈنکر کا خط تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے پڑھنا شروع کیا!۔

"میرے محترم بزرگ!

اگر میری سو جانیں بھی ہوتیں تو میں آپ کی مہربانی، احسان اور امداد کا بدلہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اس خواب کی تعبیر نہیں بن سکا کہ میں ایک ممتاز اور اعلیٰ درجہ حاصل کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنا پہلا فرض یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے دُکھی دیش کی خدمت کروں، اگر میں صرف اپنی ہی فکر کرتا تو یہ بڑی خود غرضی ہوتی۔ بھگونت راؤ اور میں ایک ہی اسکول کے طالب علم تھے۔ ہم دونوں غریب تھے۔ محبت اور افلاس کے احساس نے مجھے سماج اور ملک کی نجات کے لئے ایک جوشیلا کارکن بنا دیا۔ برخلاف اس کے وہ علمی اعزازات حاصل کرنے میں کوشاں رہا اور آخر کار دنیاوی ترقی کا راستہ اس نے اختیار کر لیا، یہی وجہ ہے کہ وہ صرف اپنے مالک کا خیال کرتا ہے اور عوام کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی، اس لئے ستّو اس سے نفرت کرتی ہے، اسے میری زندگی میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

جس دن سے میری ستّو سے ملاقات ہوئی، میں نے محسوس کیا جیسے میں اس کو ہمیشہ سے جانتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہماری محبت سے لاعلم نہیں ہوں گے۔ بہرحال میں نے یہ سمجھ کر کہ خوبصورت ستّو پُرمسرت زندگی کی مستحق ہے، جو میرے ساتھ ناممکن ہے۔ میں نے دانستہ اپنے آپ کو اس کے راستہ سے ہٹا لیا اور ہر وقت اس سے دور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہرکیف جب بھگونت راؤ سہانی سے اس کی شادی ہوئی تو میں نے خیال کیا اور مجھے یقین ہے کہ ستّو نے بھی یہی خیال کیا، اسے صحیح ماحول مل گیا ہے۔ لیکن اسے جلد ہی اس کا احساس ہو گیا کہ دنیاوی مسرت سے وہ کبھی سکون حاصل نہیں کر سکتی، اس کے تحت الشعور میں تصوراتی زندگی کا خاکہ ابھرتا جا رہا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ شادی کے بندھنوں کو توڑنا آسان نہیں، اسے اپنے خاوند کی خدمت کرنا لازمی تھا، لیکن وہ ایک چیز بڑی خوبی سے کر سکتی تھی کہ اپنے شوہر کو سچی اور بے لوث محبت سے بتدریج راہِ راست پر لے آئے۔ مگر یہ خط ختم کرنے سے پہلے میں ایک چیز اور کہنا چاہتا ہوں آپ نے ستّو کے کمرے میں، پرندوں کی تصویر دیکھی ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ ان پرندوں کی روایت آپ کو خاص طور پر پسند ہے۔ آپ کتنی خوبی اور وضاحت سے اسے سمجھایا کرتے تھے۔ اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور شاید آپ بھی اس سے اتفاق کریں، یہ پرندے دنیا کے غریب، بے گناہ لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چیل، ظالم اور جابر کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور روتی ہوئی عورت، ان نرم دل جذباتی انسانوں کی عکاسی کر رہی ہے جو مظلوموں کی ہمدردی میں آنسو بہاتے ہیں۔ اور رشی، وہ عالم ہے، جو ظلم اور تشدد کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ تصویر ہمارے ملک کی صورت حال کی ترجمانی کرتی ہے۔ بہرکیف میں اس کو دوسری نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں جذباتی آدمیوں اور عالموں کی جگہ ایک نوجوان مرد مجاہد کو ترجیح دیتا ہوں، جو چیل کو غریب پرندوں کو

نقصان پہنچانے سے قبل اپنے تیروں سے چھلنی کردیں اور صرف یہی کافی نہیں بلکہ نوجوانوں کو ظالم پر اپنی گرفت مضبوط کرلینا چاہیئے، تاکہ اسے ایسی شکست دیجاسکے کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکے اور مظلوم انسانیت کو نجات مل جائے۔ میری رائے میں ہم تینوں ——— آپ، ستو، میں اپنی جگہ رکھتے ہیں۔ ستو جذباتی ہے ——— آپ عالم ہیں اور میں نوجوان کے فرائض انجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں، ایک جذباتی اور ایک عالم ظلم کو نہیں روک سکتے اور ——— اگر مجھے عملی جدوجہد کے سلسلے میں کل پھانسی پر چڑھا دیا گیا تو میں اس تمنا کے ساتھ خوشی سے جان دوں گا کہ میں ستو کے رحم میں لڑکے کی شکل میں دوبارہ جنم لوں گا۔ آپ ستو کو سمجھا دیجئے کہ وہ میرے لئے آنسو نہ بہائے، بلکہ اپنے فرائض ادا کرے اور اپنے خاوند کو تاریکی میں روشنی دکھائے۔

صدہا تعظیمات کے ساتھ

آپ کا بدقسمت : ڈنکر سار ڈیسائی

دادا صاحب اس انکشاف سے حیران رہ گیا اور اس نے بھگونت راؤ کو یہ خط دکھانے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ ستو کے خلاف اس کے شبہات دور ہو جائیں، اچانک اسے یہ آواز سنائی دی "کملا مجھے تنہا چھوڑ دو" —۔ اس کے بعد قدموں کی آہستہ آہستہ چاپ آئی۔ اس نے دیکھا کہ بھگونت راؤ جھیل کی طرف جا رہا ہے۔ دادا صاحب تیزی سے اس کی طرف دوڑا اور جب وہ اس کے پاس پہنچا تو بھگونت راؤ ایک چٹان پر بیٹھا تھا، اس نے کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے نام کا ڈنکر کا خط کھول لیا تھا، میں نے اس کو پڑھ کر دوبارہ بند کر دیا تھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ ستو کے نام یہ اس کا آخری محبت بھرا خط ہوگا" تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا "آپ جانتے ہیں کہ ایک عرصے سے میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ستو ڈنکر کی محبت میں پریشان ہو رہی ہے۔ کسان سبھا کے جلسے کے وقت معاملہ عروج پر پہنچ گیا۔ مجھے دلیپ کی ماں کے بستر پر ستو کا ایک خط ملا جہاں میں علاج کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ستو نے دل کی شدید تکلیف کا محض بہانہ کیا ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ ڈنکر اس کے پاس ہوگا، اور وہ وہیں موجود تھا۔ ستو نے فوراً اپنے آپ کو اس کی آغوش میں گرا دیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میرا اس وقت دل کیا گزرتا، خیر ہوئی کہ وہ چلی گئی ——— شاید وہ ہمیشہ کے لئے" دادا صاحب نے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں وہ ضرور واپس آئے گی"۔ "مگر مجھے اس کی امید نہیں" بھگونت راؤ نے کہا۔

"ہم میں بنیادی اختلاف ہے، وہ تخیل پرست لڑکی اور میں مادیت پسند، دونوں اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ آپ مجھے سمجھنے کے لئے میرے ماضی کو دیکھئے، میں ایک بہت ہی غریب طالب علم تھا، حتیٰ کہ قریبی رشتہ دار تک مجھے غریبی کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے تھے۔ چنانچہ میں نے سخت جدوجہد کی اور امتیازی طور پر میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد میں میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا، وہاں ایک لڑکی کو اسے مجھے محبت ہو گئی اور وہ بھی مجھے چاہنے لگی، مگر اس نے کسی دوسرے مالدار شخص سے شادی کر لی۔ میں نے سمجھا کہ روپے سے محبت کو بھی خریدا جا سکتا ہے، اس وقت سے میرا واحد مقصد روپیہ اور صرف روپیہ بن گیا۔ مگر ستو نے مجھے بتا دیا کہ نظریات اور تصورات کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ جب وہ واپس گھر آئے تو دادا صاحب نے اس کو ستو کی نوٹ بک دے دی اور بتایا کہ یہ اس کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ بھگونت راؤ نے اسے فوراً ہاتھ میں لے لیا اور باہر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی اور پھر ستو دادا صاحب کے سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "پتا جی" ستو نے دادا صاحب کے بازوؤں میں گرتے ہوئے کہا "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اصل حقیقت راجہ صاحب کو بتا کر دلیپ کو چھڑوا لوں گی۔ آپ بھگونت راؤ سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی ہوں اور ان کی رہوں گی"

اچانک انھیں نیچے ایک موٹر کے رکنے کی آواز آئی اور بھگونت راؤ کسی شخص کے ساتھ اترتا ہوا نظر آیا، وہ اوپر آگئے دوسرا شخص دلیپ تھا ——————!

دلیپ نے کہا "آپ نے مجھے بہت کچھ سکھ دیا ہے۔ اب ان ڈاکٹر صاحب کو بھی آپ کی تعبیر کی ضرورت ہے —— انھوں نے صرف مجھے رہا کرایا ہی نہیں بلکہ اپنے عہدے سے بھی استعفا دیدیا ہے اور عوام کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، وہ میریا کی ریسرچ کے لئے جارہے ہیں تاکہ اس وبا کے انسداد کے لئے کوئی معقول علاج معلوم کرسکیں، جس سے ہمارے گاؤں میں سیکڑوں جانیں ضائع ہوتی ہیں۔"

دادا صاحب نے اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بھگونت راؤ کی طرف مخاطب ہوکر کہا "سنو تمھارا اندر انتظار کررہی ہے"

"ارے!" بھگونت راؤ نے کہا اور ایک ہی جست میں اندر چلا گیا۔

عاتق شاہ

یہ ہے ایک گلی؟

آبادی سے دور شہر کے اس کونے میں اس گلی کا یوں چپکے چپکے سب سے الگ تھلگ رہنا اتنی ایک اجنبیت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ نہ مجھے جانتی ہے اور نہ میں اسے پہچانتا ہوں۔ پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اس سے خوب واقف ہوں۔ ایک زمانے سے اس کی میری دوستی ہے اور ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہم دونوں میں قائم ہے۔ پھر بھی ہم دونوں انجان ہیں، نہ جانے کیوں!۔

یوں تو میں نے بہت سی گلیاں دیکھی ہیں، لمبی لمبی بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح، تنگ و تاریک قبر کی طرح۔ پتلی پتلی، جہاں سے ایک انسان کا گذر بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ اندھیری جہاں سورج کبھی نہیں چمکتا۔ اونچی نیچی، ٹیڑھی میڑھی، گندی بدبودار اور پھر ایسی جہاں انسان چلتے ہوئے یہ محسوس کرے کہ اس کی سانس رک رہی ہے اور اس کا دم جیسے اب نکل ہی جائیگا۔ بند اجن میں ہوا کا کبھی گذر نہیں ہوتا۔ گلیاں پیچ در پیچ عورت کی طرح۔ گلیاں ویران جس میں کوئی نہیں چلتا۔ اور پھر چند ایسی گلیاں، جو رکتی، ٹھہرتی، سنبھلتی، پھسلتی، سکڑتی ہوئی کسی ایک وسیع سڑک پر جا کر دم توڑتی ہیں۔ غرض میں نے سیکڑوں گلیاں دیکھی ہیں، نام گنانے سے کیا فائدہ لیکن ایسی گلی۔ جی ہاں ایسی گلی میں نے ابتک نہیں دیکھی۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے پچھلی دیکھی ہوئی گلیوں کو بھول گیا ہوں۔ اب میرے حافظہ میں یہی ہے۔ جیسے مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا۔ دس مہینے کے قلیل عرصے میں میں اسے خوب پہچان گیا ہوں اور اب میں اس کی نس نس سے واقف ہوں۔

یہ گلی گھر کی سیدھ میں دور تک جا کر یکدم رک گئی ہے۔ اس میں نہ ٹیڑھا پن ہے اور نہ کوئی پیچ و خم۔ اس کی چال بالکل سیدھی ہے۔ اب تک اس کی چال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا ایک ہی انداز ہے، جس پر وہ ابتک قائم ہے۔ میں نے اسے کبھی رنگ بدلتے نہیں دیکھا۔ اس میں وہی متانت جو پہلے روز میں نے دیکھی۔ ہاں یہ بلا کی سنجیدہ ہے۔ دن رات کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ ہر وقت خاموش رہتی ہے، اور یہ سنگلاخ چٹانوں سے بنائی گئی ہے۔ سطح اور ہموار ڈھلواں نام کو نہیں۔ سیدھی بالکل سیدھی۔ اس کا یہ پُرنا رنگ ہے جو کبھی نہیں بدلا۔ سیدھی اور سخت!۔

یہ گلی اپنی آغوش میں کئی گھروں کو چھپائے ہوئے ہے۔ یہ گھر آمنے سامنے ایک قطار میں دور تک چلے گئے ہیں۔ یہ گھر ارشد کا ہے۔ اس گھر میں مولانا رہتے ہیں۔ یہ گھر عاقلہ کا ہے۔ اس گھر میں ایک بڑھیا رہتی ہے اور وہ چنو خاں کا گھر ہے اور اس گھر میں جو گلی کے بالکل سیدھ میں کھڑا ہے ایک عورت رہتی ہے اور اس میں میں رہتا ہوں یہ میرا گھر ہے!۔

یہ سچ ہے کہ میں اس میں رہتا ہوں، لیکن یہ میرا گھر نہیں۔ میرا کوئی گھر نہیں اور نہ میرے باپ کا کوئی گھر تھا اور نہ دادا نے کوئی گھر چھوڑا۔ سب دوسروں کے گھروں میں رہتے آئے ہیں اور یہ چال مجھے بھی آتی ہے اور اس کی وجہ سے مجھے کافی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اور ہر وقت مجھے اندھیری اور تاریک گلیوں میں بھٹکتے پھرنا پڑتا ہے، مکان کی تلاش میں، گھر کی تلاش میں۔

لیکن جدھر بھی میں جاتا ہوں، سیٹھ بنسی لال اور سیٹھ ہزاری مل کا سامنا ہوتا ہے۔ اور ایک دن جب میں بھٹکتے ہوئے ادھر آیا تو سیٹھ ہزاری مل سے مڈبھیڑ ہوئی اور ساتھ ہی میں سہم کر رہ گیا اور میں نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک مکان کی ضرورت ہے"

سیٹھ ہزاری مل نے اپنی بڑھی ہوئی توند پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "ایک گھر ہے ساٹھ روپیہ کرایہ!"

میں نے کہا "اتنی تو میری تنخواہ نہیں"

سیٹھ ہزاری مل نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "تو مجھے کیا، بھاگ جاؤ یہاں سے!"

اور اُس وقت میں ہکا بکا ایک بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی مدد کرے، لیکن کوئی نظر نہ آیا اور گلی خاموش تھی۔ خاموش، جیسے کسی سوچ میں ہو۔ اور جب میں بھاگنے ہی والا تھا تو ایک نوجوان نے مجھے روک لیا اور اپنا گھر کرائے پر دیکر مجھے ایک نامعلوم مدت کے لئے آوارہ گردی سے بچالیا، اور اب اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں۔

صبح سویرے گلی میں ٹہلنے کی ایک عادت سی ہوگئی ہے۔ سب سے پہلے جس کی صورت نظر آتی ہے وہ اُس نوجوان کی جس کے گھر میں رہتا ہوں اور جس کا نام ارشد ہے۔ ارشد کا نہ پیٹ بڑا ہے اور نہ اُس کی توند ہے۔ ارشد ایک دبلا پتلا نوجوان ہے اور ایسے دُبلے پتلے آدمیوں سے میری دوستی بہت جلد ہوجاتی ہے اور میرے جتنے بھی دوست ہیں وہ سب کے سب دبلے پتلے۔ ارشد بھی دبلا پتلا ہے اور ارشد میرا دوست ہے۔ ارشد کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ہندستانی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے اور یتیم ہے۔ یتیم اس لئے ہے کہ اُس کے ماں باپ اُسے اب مزید تعلیم دلوانے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے وہ تنگ آکر چلی گئی ارشد سے دور، اس گلی سے دور، اس شہر سے، اس زمین سے دور، اس دنیا سے دور۔ اور اب ارشد اکیلا ہے اور اُس کی ساتھ یہ گھر، جس کے کرایہ سے اس کا حلق بھیگتا ہے۔ اور روزانہ صبح ایک نئی درخواست تیار کرکے اپنی سند کے ساتھ لیجاتا ہے، اور نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا ہے، اور رات میں آتا ہے۔ اُس وقت وہ بڑا دلچسپ نظر آتا ہے، بالکل مجنوں کی طرح۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی صحت دن بدن گرتی جارہی ہے اور اُسے طرح طرح کی بیماریاں ہوگئی ہیں۔ دماغ کی بیماری، حافظہ کی بیماری، پھیپھڑوں کی بیماری، معدہ کی بیماری، گردوں کی بیماری۔ غرض قسم قسم کی بیماریاں اور ہاں، ایک اور بیماری اُسے ہے، اور وہ ہے دل کی بیماری۔ یہ بیماری بڑی خطرناک ہوتی ہے اور وہ ارشد کو ہے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ کو دل پر رکھ کر دباتا ہے اور کبھی کبھی اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو دباتے ہوئے کہتا ہے "یار تم اس دل کو نہیں جانتے۔ یار تم صفیہ کو نہیں جانتے۔ تم کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ ہائے وہ ظالم۔ تم نے اُسے دیکھا نہیں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ کیسی ہے۔ اُس کی وہ نشیلی آنکھیں، اور وہ سُریلی آواز، جیسے کہیں دور سے ندی گنگناتی بہہ رہی ہو۔ اور وہ ناگن سی چال اور اس کی لہراتی ہوئی وہ سیاہ لٹیں، جیسے سانپ پھن اُٹھائے بیٹھے ہوں۔ ہائے یار میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ کیسی ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ سچ یار تم صفو کو نہیں جانتے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ——"

اور جب اس کا نشہ بڑھنے لگتا ہے تو وہ کہتا ہے "یار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا، وہ میرے دل پر، دماغ پر، روح پر چھائی ہوئی ہے۔ بتلاؤ یار میں کیا کروں۔ بتاؤ یار ——"

لیکن میں اس سے کچھ نہیں کہتا۔ چونکہ ارشد کے پاس ایک شیروانی ہے اور وہ اسے دھو دھو کر پہنتا ہے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے صفو کے پاس ان گنت ساڑیاں ہیں اور وہ دن میں کئی بار بدلتی ہے اور سنا ہے کہ اس کے باپ کی توند سیٹھ ہزاری مل سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ میرے دوست میں ابھی بچپن ہے۔ پھر بھی اس کی آرزو ہے کہ اُسے کسی طرح اپنالے چونکہ وہ اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اور اُسے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس کئی شیروانیاں ہوں اور اُس کی جیب گرم ہو۔ اس لئے روزگار کی تلاش میں وہ روز صبح سویرے رات میں تیار کی ہوئی درخواست کو سند کے ساتھ لئے ہوئے جاتا ہے نوکری کی تلاش میں۔ اور گلی اونگھتی رہتی ہے۔

دس بجے پڑوس سے ایک بزرگ مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ شاید ناشتہ کرکے آرہے ہیں۔ ان کی لمبی لمبی زلفیں اور ہوا میں لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی کو دیکھ کر مجھے ڈاکٹر ٹیگور یاد آجاتے ہیں۔ اور ان کے مقدس چہرے کو دیکھ کر کئی بار

درود پڑھنے کو جی چاہا۔ واقعی کیا شان ہے، کیا نور ہے اور کیا جلال ہے، خصوصاً ان کے اس ڈنڈے میں جو وہ اپنے ہاتھ میں تھمائے ہوئے رکھتے ہیں۔ میں انھیں دور ہی سے دیکھ کر آداب بجالاتا ہوں اور وہ ڈنڈے کو گھماتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی میں کھسک جاتا ہوں!۔

راتوں میں ان کی آوازیں وہ آوازیں جو کانوں کے پردے پھاڑ ڈالتی ہیں، گلی کے سرے تک سنی جاسکتی ہیں۔ ان کی باتیں اور ان کے طرزِ گفتگو اور لب و لہجہ سے مجھے استاد چنّو یاد آجاتا ہے جو اسی گلی میں بائیں طرف والے مکان میں رہتا ہے۔ سمجھتا تھا کہ فحش بکنے میں، اسے جتنی مہارت ہے وہ شاید کسی کو نہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ مرشدِ کامل چنّو استاد سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی نئی نئی ترکیبوں و فنّی اصطلاحوں میں ردیف و قافیہ کا توازن کبھی نہیں بگڑتا اور کبھی یہ بہت زیادہ ترقی پسند ہوجاتے ہیں تو ان کی یہ اصطلاحیں ایک نئی جدت کے ساتھ آزاد نظم ہوکر رہ جاتی ہیں۔

ساتھ ساتھ بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ روز صبح سویرے ان کے گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز آتی ہے۔ قرأت خوب ہے اکثر اوقات میں نیند سے چونک اٹھتا ہوں اور سات آسمانوں پر بیٹھے ہوئے خدا کو یاد کرنے لگتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے خود پر رونا آتا ہے۔ اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ سات آسمانوں کے اوپر میرے لئے دوزخ میں ایک گھر تیار ہو رہا ہے اور مولانا کے لئے جنّت میں محل۔ اور کبھی مولانا سے جلن سی ہونے لگتی ہے۔ واہ یہ بھی کوئی انصاف ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوں لیکن قرآن پڑھنے کی آواز ——— اور میں خاموش ہوجاتا ہوں ———

ہر بیوی کے مرنے کے بعد، ایک کنواری لڑکی سے شادی رچانا مولانا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ مولانا نے اب تک تین شادیاں کیں اور تینوں کنواری لڑکیاں۔ پہلی کے متعلق روایت ہے کہ مولانا نے اپنے ڈنڈے سے اس بُری طرح پیٹا کہ بیچاری پھر زندہ نہ رہ سکی۔ دوسری کی نسبت کہا جاتا ہے کہ باؤلی میں گر کر خودکشی کرلی اور تیسری کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک گبرو لونڈے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اب یہ چوتھی ہے!۔

اور جب ان کی اس چوتھی نئی نویلی دلہن کو دروازے میں چوکھٹ کے پاس کھڑا دیکھتا ہوں تو اس کی معصومیت اور خاموش حُسن پر ترس آنے لگتا ہے۔ جوانی بے کس اور خاموش جوانی۔ مایوسی، بڑھاپے کی گود میں پلنے والی یہ مچلتی ہوئی جوانی۔ جوانی اپنی پوری نہ ہونے والی خواہشوں کی فریاد کرنے والی جوانی۔ جی میں آتا ہے ——— جی میں آتا ہے کہ ———
لیکن ایک فٹ کی داڑھی اور ڈھائی فٹ کا ڈنڈا میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے!۔ جب مولانا اپنے نپے تلے قدموں کے ساتھ اپنے موٹے ڈنڈے کو بجاتے ہوئے چلے جاتے ہیں تو گلی میں پہلی سی اداسی تیرنے لگتی ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک رکشا گلی میں رینگتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں اس رکشا سے واقف ہوں۔ جب سے یہاں آیا ہوں، اس رکشا کو روز اسی گلی میں دیکھتا ہوں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ رکشا نہ آتا ہو۔ روز آتا ہے۔ لیکن کہاں سے آتا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ میری معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ یہ رکشا آتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کو بٹھائے ہوئے، اس لڑکی کا نام عاقلہ ہے اور یہ عاقلہ کا گھر ہے۔
لیکن عاقلہ کون ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ اس گلی میں کیونکر آگئی یہ بھی نہیں جانتا، لیکن یہ کہ اس لڑکی کا گھر ہے جس کا نام عاقلہ ہے اور جس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں اور ایک بیوہ ماں اور جس کا باپ ایک طویل بیماری کے بعد سب کو اس گلی میں چھوڑ کر چل دیا۔ جہاں سے کہ وہ آیا تھا۔ اور اب عاقلہ اپنے دو بھائیوں اور بیوہ ماں کو لئے اسی گلی میں رہتی ہے۔

پہلی بار جب میں نے عاقلہ کو اس گلی میں دیکھا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کوئی چیز کھو دی ہے۔ کوئی چیز جو مجھے یاد نہیں۔ جس وقت عاقلہ کے سانولاتے ہوئے چہرے پر چمک تھی اور اس کے تپتے پتلے ہونٹوں پر امرت تیر رہا تھا،

اور اس کا جوبن ایک چڑھتی ہوئی ندی کی طرح امنڈتا ہوا آرہا تھا اور اس کی آنکھوں میں پچھلی رات کے حسین خوابوں کی جھلک تھی۔ اُس وقت میں نے عاقلہ کو دیکھا تھا۔ اور یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ عاقلہ کا باپ زندہ تھا۔

لیکن آج عاقلہ کا باپ زندہ نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اُس کے چہرے کی چمک غائب ہوگئی اور امرت چوس لیا گیا اور چڑھتی ہوئی ندی یکدم سوکھ کر رہ گئی، حسین سپنے بکھر کر رہ گئے۔ اور آنکھوں میں رات کی خوفناک سیاہیاں تیرنے لگیں۔ اس کی اس تبدیلی سے گھر میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس کی بوڑھی بیمار ماں کو دوائی ملنے لگی اور وہ بھلی چنگی ہوگئی۔ ننھے ننھے بھائیوں کے میلے کچیلے کپڑوں میں یکدم اُجالا ہوگیا۔ اور ٹھنڈے چولھے میں ٹانگیں پھیلا کر سونے والی بلّی بھاگ کر چلی گئی۔ نہ جانے کہاں! غرض پورا گھر بدل گیا۔ اور یہ محض اس کی وجہ سے اور یہ عاقلہ ہے۔ میری پڑوسن!۔ اور یہی وہ رکشا ہے جو میری پڑوسن کو لے آتا ہے، نہ جانے کہاں سے۔ روز اسی وقت۔ گلی ایک زمانہ سے اس رکشا کو دیکھ رہی ہے لیکن خاموش!۔

اس وقت گلی میں کوئی نہیں ہوتا، لیکن بوڑھی بیٹھی رہتی ہے۔ اس بوڑھی کا کوئی وقت نہیں۔ اس کو ہر وقت ہر لمحہ اس گلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ان سب گھروں کی اور اس گلی کی رکھوالی کرتی ہے اور کبھی ایک بھوکے کتے کی طرح اِدھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی میں اسے دیکھ کر سوچتا ہوں کہ یہ چل پھر کیسے سکتی ہے۔ یوں بید کی طرح زخم کھاتی ہوئی کمر اور یوں ہوا کے ہلکے سے جھونکے پر ہلنے والی گردن کیا یہ ممکن ہے کہ اس میں پہلی سی اکڑ پیدا ہوجائے۔ اس کے ایک پھوڑا بھی ہے، بائیں طرف کی چھاتی سے لیکر نیچے پسلی تک زخم پھیلتا جا رہا ہے۔ اور یہ دن بدن گہرا اور خطرناک ہوتا جا رہا ہے اور یہ زہر بہت ممکن ہے کہ جسم کی بوٹی بوٹی میں سرایت کر جائے۔ خون اور پیپ تو روز ہی بہتا رہتا ہے۔ باوجود ان ساری مصیبتوں کے یہ گلی سے نہیں ہٹتی۔ جاڑا۔ برسات۔ سردی۔ گرمی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اور وہ ہر وقت گلی میں بیٹھی رہتی ہے۔ اس کو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دیوانی ہے!۔

سچ مچ یہ دیوانی ہے اور یہ دیوانی اُس وقت سے ہوگئی ہے جب سے کہ اس کے جوان ہٹے کٹے بیٹے کو مار ڈالا گیا۔ اس کا کیا جرم تھا یہ بات میں نہیں جانتا۔ نہ اُس نے کسی کے گھر ڈاکہ مارا تھا، نہ کسی شریف زادی کو بھگا کر لے گیا تھا اور نہ اُس نے کوئی ایسی خاص سازش کی تھی اور نہ اُس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادھا ہنس مکھ نوجوان تھا اور جس کے قہقہوں سے گلی کا ذرہ ذرہ گونج پڑتا تھا۔ لیکن اُسے مار ڈالا گیا۔ اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ہندو تھا۔ اور مسلمانوں نے اسے مار دیا۔ اور اگر وہ مسلمان ہوتا تو ہندو اسے مار ڈالتے۔ غرض اس کا مارا جانا ضروری تھا۔ اٹل تھا۔ اور وہ مارا گیا۔ اور اس کا فولادی جسم مردہ پڑا تھا اور اس کے چوڑے چکلے سینے سے خون اُبل رہا تھا۔ اور گولی اس کے اندرونی حصوں کو چھلنی کر چکی تھی اور وہ خاموش پڑا تھا۔ اور اُس کی بوڑھی ماں اس کے مردہ جسم سے لپٹ کر رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور وہ گلی کے ایک ایک آدمی کو پکڑ کر پوچھ رہی تھی کہ

"بتاؤ! تم نے میرے لال کو کیوں مار ڈالا۔ بتاؤ اُس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے کیوں چھوڑتے ہو۔ میں بھی اپنے بیٹے کے ساتھ چلی جانا چاہتی ہوں۔ اب اکیلی رہ کر کیا کروں۔ اب کسے اپنا لال کہہ کر پکاروں اور اب بڑے چاؤ کے ساتھ کس کا بیاہ رچاؤں۔ اب کون ہے جو مجھے ماں کہکر پکارے گا۔ اب کون ہے جو میرے گلے میں باہیں ڈالیگا۔ بوسے، لاڈ کریگا۔ اب کون ہے جو چاند سی دلہن لاکر یہ کہیگا کہ ماں! یہ تیری بہو ہے۔ اب کون ہے ——— ؟ بتاؤ میں کیا کروں۔ بتاؤ ——— !

وہ چھاتی پیٹ رہی تھی۔ اور مولانا کی داڑھی پر مسکراہٹیں جھل مل کر رہی تھیں!۔

لیکن گلی خاموش تھی!۔

اب بڑھیا بھی خاموش ہوگئی ہے۔ نہ کسی سے بات کرتی ہے اور نہ کچھ بولتی ہے۔ نہ آنکھوں میں آنسو ہیں اور نہ ہونٹوں پہ

آہیں۔ صرف خاموش بیٹھی رہتی ہے اور یہ گلی میں ہر وقت نظر آتی ہے، گویا گلی سے اس کا ابدی ناتہ ہے۔ ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ۔ اور گلی کے ساتھ چپکے چپکے اونگھا کرتی ہے۔

کھڑی دھوپ میں یہاں کوئی نہیں آتا بعض بعض وقت کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر آجاتا ہے، مکان کی تلاش میں گھر کی تلاش میں!۔ گھر تلاش کرنا واقعی بڑا مشکل کام ہے۔ ہر چیز تلاش کرلی جاسکتی ہے، ہر چیز کو ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ ہر چیز حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر سات آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا کو بھی ڈھونڈ لیا جاسکتا ہے۔ لیکن مکان کو نہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کوئی گھر نہیں۔ چونکہ سارے گھروں پر سیٹھ ہزاری لال جیسے فرشتوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اور اب مکان کیسے ملے؟۔

اس لئے یہاں جتنے بھی آتے ہیں انھیں مکان نہیں ملتا۔ چونکہ یہاں ایک ایک کمرہ کا کرایہ ساٹھ روپیہ، ستر روپیہ، اسی روپیہ ہے اور یہ آنے والے مسافر بہت چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے، وہ گڑگڑا کر کہتے ہیں کہ "سیٹھ صاحب کم کیجئے!"

سیٹھ صاحب کی توند ہلنے لگتی ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور انھیں وہی جواب ملتا ہے جو مجھے ملا تھا "چلو — بھاگ جاؤ یہاں سے!" اور وہ بھاگ جاتے ہیں!۔ ایک عرصہ سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے۔ لیکن گلی خاموش ہے۔

کچھ دیر تک گلی اکیلی رہتی ہے اور یہاں کوئی نہیں آتا اور چاروں طرف خلا ہی خلا رہتا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ بڑھیا ہے یا نہیں۔ لیکن بڑھیا بیٹھی رہتی ہے۔ اونگھتی ہوئی!۔

جب دھوپ کھسکتی ہوئی گلی کی دیواروں پر چڑھنے لگتی ہے تو کئی بچے کھیلنے لگتے ہیں۔ بچے کمزور، نڈھال اور ناتواں بچے، ننگے کالے کالے، گندگی میں نہائے ہوئے بچے، بچے چھتڑے لگائے ہوئے اور جن کے پاس سے بدبو آتی ہے اور جن کی ناکیں ہمیشہ بہتی رہتی ہیں اور جن کی صورت دیکھتے ہی متلی ہونے لگتی ہے ننگے تکونے جسم والے، چپٹی ناک والے، ٹھگنے، موٹے، کمزور سے بچے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانا نہیں کھاتے گھاس کھاتے ہیں۔ انھیں کچھ کام کاج نہیں۔ دن بھر ادھر ادھر مختلف گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہیں اور اس وقت آتے ہیں۔ یہ گنتی میں کُل بارہ ہیں۔ یعنی ایک درجن۔ اور یہ خاص حضرت مولانا کی پیداوار ہیں جن کے سارے حقوق مولانا کے نام محفوظ ہیں۔ یہ بارہ ہیں۔

یہ بارہ بچے مختلف اوقات میں مختلف بیویوں نے دیئے ہیں، وہ بیویاں جو اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں، اپنے بچوں کو چھوڑ کر، تاکہ ہمیشہ اندھیری گلیوں میں بھٹکتے رہیں۔ تاکہ اپنے کالے کالے جسموں اور چیتھڑوں کی نمائش کرتے رہیں۔ تاکہ جہاں بھی جائیں اپنے ساتھ گندگی اور رذالت لیتے جائیں اور مولانا خوش ہیں کہ یہ ان کے بچے ہیں، اور وہ ان کے باپ!۔

مولانا کی بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی پلٹن میں جتنا ہو سکے اتنا اضافہ کریں۔ لیکن اس سلسلہ میں مولانا کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ چونکہ حکیم اجمل خاں مرگئے اور ان کے سارے شاگرد مرگئے۔ اب دہلی میں کوئی حکیم زندہ نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ حکیم نہیں۔ حجام ہے، چونکہ وہ اس دوائی سے واقف نہیں جو مولانا کی پلٹن میں اضافہ کرسکے۔ اسی لئے مولانا خاموش ہیں۔ اداس ہیں۔ اور ان کی بیوی اس طویل خاموشی سے اکتا کر دروازہ میں کھڑی رہتی ہے، نہ جانے کیوں؟۔

مولانا کو آتے دیکھ کر بچوں کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور سب چوہوں کی طرح اپنے گھر میں گھس جاتے ہیں، بڑی دیر تک مولانا کی بڑی بڑی آوازیں آتی رہتی ہیں اور یہ دن بھر کی تھکاوٹ اور غصّہ کو اپنی بھولی بھالی کمسن بیوی پر اتارتے ہیں یہاں تک کہ ایک خاص وقت کے بعد یہ آوازیں خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔ اور سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ہوتا۔

ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ، گلی کی سیدھ میں سامنے والے مکان کے دریچہ میں ایک عورت کو کھڑا دیکھا جاسکتا ہے جو دُور آسمان کے آخری کناروں کو گھُورا کرتی ہے۔ میں نے اس عورت کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر نہیں دیکھی ہر وقت کسی سوچ میں، ہر وقت سنجیدہ، جیسے وہ مسکرانا جانتی ہی نہیں۔ یہ متانت یہ سنجیدگی تکلیف دہ ہے۔ اس عورت کو سنجیدہ نہیں رہنا چاہئے۔ کسی بھی حسین عورت کو سنجیدہ نہیں رہنا چاہئے، لیکن وہ جانتی نہیں اور وہ خاموش چپکے چپکے آسمان کو گھورا کرتی ہے۔ آسمان کو گھُورنا کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں کی عورتیں بات بات پر آسمان کو گھورا کرتی ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہیں گی۔ کسی کو کچھ نہیں بولیں گی۔ چونکہ یہاں کی عورت کے مُنھ میں زبان نہیں، گونگی ہے۔ جانور کی طرح۔ اور اگر کچھ کہنا ہوتا ہے تو آسمان کو گھورنا شروع کر دیتی ہے اور جب یہاں کی کوئی عورت آسمان کو گھورتی ہے تو سنتے ہیں کہ آسمان پھٹ پڑتا ہے، زمین دہلنے لگتی ہے، طوفان آتے ہیں۔ غرض بڑا بُرا ہوتا ہے جب یہاں کی کوئی عورت ——————

ایسے بھی سنتے ہیں کہ اللہ میاں کالی عورتوں کو بہت پسند فرماتا ہے۔ ان کی ہر بات کو بڑے غور سے سنتا ہے اور ان کی ہر خواہش اور ہر آرزو کو پوری کرتا ہے۔ معلوم نہیں کالی عورتوں میں کیا بات ہے۔

یہ عورت دریچہ میں کھڑی ایک زمانہ سے آسمان کو گھورتی ہوئی آئی ہے۔ آسمان، نیلا آسمان اور آسمان لال آسمان، رنگ برنگ آسمان، یہ آسمان جو ہر وقت رنگ بدلتا رہتا ہے۔ گرگٹ کی طرح۔ اور یہ عورت گھورتی ہوئی آئی ہے۔ لیکن ابھی تک آسمان پھٹا نہیں، زلزلے آئے نہیں۔ زمین کی گردش میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا شوہر گھر آیا نہیں۔ چار سال ہو چکے ہیں جنگ ختم ہو چکی، لیکن اس کا شوہر آیا نہیں۔ اب اس کا شوہر کبھی نہیں آئیگا، چونکہ اس کا شوہر جنگ میں مارا گیا اور اب اس ہزاروں میل دور کسی تاریک گہرے کھڈ میں پڑا میٹھی نیند سو رہا ہے اور وہ اب کیسے جاگے! اور اتنا طویل اور لمبا راستہ کیسے کیسے طے کرے۔ وہ سو رہا ہے، وہ کبھی نہیں جاگیگا، اُسے کسی بات کی فکر نہیں، نہ گھر آنے کی، نہ اپنی بیوی سے ملنے کی۔ اور نہ اُسے اپنے کئے ہوئے وعدے یاد ہیں، اُسے کچھ بھی یاد نہیں کہ اُسے اپنی بیوی کے لئے چاکلیٹی رنگ کی ساڑی خریدنی ہے۔ نہ اُسے اس بات کا ہوش ہے کہ گھر کو خط بھیجے ہوئے بہت دن ہو چکے۔ اس کی بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ اُسے جلد خط بھیجنا چاہئے۔ اُسے کچھ بھی یاد نہیں وہ بیہوش ہے۔ وہ خط کبھی نہیں لکھیگا، وہ گھر نہیں آئیگا۔ کبھی نہیں۔ یہ بات عورت جانتی ہے، گھر کے سارے لوگ جانتے ہیں، پورا محلہ جانتا ہے، لیکن پھر بھی وہ آسمان کو گھورا کرتی ہے!۔

روز اسی وقت میں اس عورت کو دریچہ میں کھڑی دیکھتا ہوں۔ یہ عورت سنجیدہ نہ رہے میں سوچتا ہوں۔ اُس کی بُجھی بُجھی آنکھوں میں پھر سے چمک پیدا ہو جائے اور اس کے اُترے ہوئے چہرے پر پہلی سی رونق آجائے اور اس کے خالی خولی، بے رونق اُداس اور ننگے ہاتھوں میں پھر سے چوڑیاں بجنے لگیں، وہ چوڑیاں جو ٹوٹ چکیں، وہ چوڑیاں، جو دولہا اپنی دلہن کو پہناتا ہے، وہ چوڑیاں جو عورت کی زندگی ہیں، وہ چوڑیاں جنھیں عورتیں سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں، وہ چوڑیاں جو سہاگ کی نشانی ہیں اور وہ ٹوٹ چکیں اور یہ ہاتھ بے رونق سے ہو گئے ہیں۔ اتنے حسین ہاتھوں کو ویران نہیں ہونا چاہئے۔ میں ان اداس ہاتھوں کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ ہاتھ ناپسند نہیں۔ بغیر چوڑیوں کے حُسن نامکمل ہے، عورت نامکمل ہے، جوانی نامکمل ہے۔ ان ہاتھوں میں چوڑیاں ہونی چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان ہاتھوں میں چوڑیاں پھر سے بجنے لگیں ——

لیکن اب تک اس کے ہاتھ خالی ہیں اور گلی خاموش ہے!۔

سائے گہرے، اور سیاہ ہوتے جاتے ہیں اور گلی پر ایک خوفناک اداسی چھا جاتی ہے اور بوڑھیا ایک بھوکے کتے کی طرح بیٹھی گلی کی رکھوالی کیا کرتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی ہے، جیسے اُسے کسی کی تلاش ہے، جیسے اُسے کسی کا انتظار ہے

یہ یہاں سے کبھی نہیں ہٹ سکتی اور نہ موت اُسے جدا کر سکتی ہے۔ بوڑھی امر ہے۔ گلی کا اس کا اپنا ہمیشہ ساتھ رہیگا یہ اس گلی کی پرانی سہیلی ہے۔

رات آتی ہے چپکے چپکے، دبے پاؤں۔ اور اُس کے آنے کی کسے بھی خبر نہیں ہوتی اور گلی پر ایک گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس وقت گلی اور سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ غالباً یہ کچھ سوچتی ہے۔ یہ کیا سوچتی ہے۔ اسے کیا سوچنا چاہئے۔ یہ نہیں معلوم، لیکن ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ سوچتی ضرور ہے۔

چاروں طرف اندھیرا پھیلتا رہتا ہے اور بیچ گلی میں لگی ہوئی بلدیہ کی قندیل اونگھتی رہتی ہے۔ بوڑھی کی طرح۔ ایسے وقت استاد چنو کے تانگے کی آواز آنے لگتی ہے، وہ گلی پر مڑتے ہوئے اپنے گھوڑے کو منانے لگتا ہے کہ چل بیٹا چل آگیا اپنا گھر اور گھوڑا ہی ہی کرتا ہوا اپنے مالک سے کہتا ہے کہ ہاں آگیا اپنا گھر!۔

گھوڑے کو باندھتے ہوئے استاد چنو بلند آواز سے گانے لگتا ہے :—

ایک شہر کی لونڈیا نظروں کے تیر چلا گئی —
ہاں نظروں کے تیر چلا گئی
کر کے اشارے بلا گئی
ایک شہر کی لونڈیا —— نظروں کے ——

استاد چنو جیسے ہٹے کٹے نوجوان کا ایک شہر کی لونڈیا کے تیر کا یوں گھائل ہو جانا واقعی ایک عجیب بات ہے۔ میں بار بار یہ سوچتا ہوں کہ کیا ایسا ممکن ہے، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ چونکہ استاد چنو کے بارے میں کسی لونڈیا کے نظروں کے تیر کا ذکر کچھ جچتا نہیں اور نہ استاد چنو کے فولادی جسم پر نظروں کے تیر کچھ اثر کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُسے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ کسی سے آنکھیں لڑائے۔

استاد چنو شہر کی لونڈیوں کے بارے میں بہت کم سوچتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ وہ اس خصوص میں کچھ بھی نہیں سوچتا، اور اگر سوچتا ہے تو آٹے دال کے بھاؤ کی نسبت۔ چونکہ اس کا ایک پیٹ نہیں اور اُسے کھانے کو نہیں چاہئے بلکہ اس کی ماں کا پیٹ ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی کا پیٹ ہے اور اُس کی مری ہوئی بہن کے چار بچوں کا پیٹ ہے، اور ان سب کے پیٹ بھرنے کا واحد ذمہ دار یہ ہے۔ یہی انھیں کھانے کو دیتا ہے، یہی پہننے کو دیتا ہے، یہی جلاتا ہے، یہی مارتا ہے، یہی ہر چیز پر قادر ہے۔ استاد چنو رازق ہے، رحیم ہے، کریم ہے، معین ہے اور یہ استاد چنو ہے!۔

صبح سے شام تک لمبی لمبی چوڑی چوڑی سڑکوں پر تانگے ہانکنے کے بعد۔ ان کو استاد چنو گھر آتا ہے اور دن بھر پسینہ بہا کر کمائی دولت سیٹھ ہزاری مل کے قدموں پر ڈالتا ہے، چونکہ یہ تانگہ ہزاری مل کا ہے۔ ہزاری مل کا ایک تانگہ نہیں کئی تانگے ہیں اور کئی استاد چنو بڑی بڑی سڑکوں پر ہانکتے پھر رہے ہیں۔ اور سیٹھ اپنے کمرے میں ریشمی صوفہ پر بیٹھا ہوا بڑھتی ہوئی توند پر ہاتھ پھیر رہا ہے!۔

اپنے گھوڑے کو باندھتے ہوئے استاد چنو گانے لگتا ہے ——

ایک شہر کی لونڈیا ——

جب وہ تھک جاتا ہے تو دوسرا گانا شروع کر دیتا ہے۔ ایک ہی چیز کے گاتے رہنے میں اُسے کوئی مزہ نہیں آتا اس لئے وہ سارے گانے گاتا ہے جو اُس نے ہوٹلوں اور سینماؤں میں سنے۔ وہ گاتا ہے۔

رات سیاہ اور تاریک ہو جاتی ہے، وہ گاتا رہتا ہے۔

ہماری گلی آنا!

دیکھو جی

اب کا پہے کو شرمانا

ہماری گلی آنا!

کسی کو ہماری گلی میں بلانے کی خواہش اور آرزو کوئی نئی نہیں۔ کئی دن سے سنتا آیا ہوں کہ استاد چنو ہر رات گلی میں کسی کو آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی اور وہ یوں ہی چلا چلا کر ہار مان لیتا ہے۔ اور سیٹھ ہزاری مل کے لمبے خراٹے گلی کے خوفناک اندھیرے میں تیرتے رہتے ہیں۔

اسی وقت ایک رکشا اس گلی سے نکل کر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے!

اور بوڑھی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بیٹھی رہتی ہے۔ جیسے اسے کسی کا انتظار ہے۔ اس کا یہ انتظار کبھی بھی ختم نہ ہوگا۔ وہ یونہی بیٹھی رہیگی، جب تک کہ اس کا بیٹا، سات آسمانوں کے پرے رہنے والا بیٹا اس دنیا میں آکر۔ اس گلی میں آکر یہ نہ کہدے کہ ماں میں آگیا ہوں۔ بوڑھی بیٹھی ہی رہیگی۔ بوڑھی کبھی نہیں ہٹ سکتی۔ بوڑھی امر ہے!۔

آدھی رات گئے جبکہ گلی پر موت کی سی خاموشی چھا جاتی ہے۔ پیروں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دیتی ہے۔ میں اس آواز سے واقف ہوں۔ یہ ارشد ہے۔ میرا دوست آرہا ہے۔ لمبی لمبی سڑکوں، فٹ پاتھوں پہ آوارہ گردی کرنے کے بعد میرا دوست آرہا ہے۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے ہیں اور اس کا سینہ ایک کمان کی طرح اندر کو چلا گیا ہے اور اس کی لمبی گردن آگے کی طرف نکلی ہوئی ہے اور اس کے چہرے پہ رات کی سیاہیاں اپنا خوفناک سایہ ڈال رہی ہیں۔ میرا دوست آرہا ہے میں اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتا بلکہ اپنے ہاتھ میں تھمی ہوئی درخواست کو بتا دیتا ہے، جو وہ صبح سویرے لکھ کر لے گیا تھا۔

جیسے وہ کہتا ہو، یار مجھ سے مت پوچھو کہ کیا ہوا۔ تم اس درخواست کو دیکھ لو۔ اس سند کو دیکھ لو، جسے لے کر میں ایک زمانے سے پھر رہا ہوں اور جسے کوئی نہیں پوچھتا اور جس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ اب تک میرے پاس ہے نجانے ابھی کتنے دن رکھنا ہوگا۔ بتا دو یار مجھے ابھی کتنے دن آوارہ گردی کرنا ہوگا۔ بتا دو یار مجھے ابھی کتنے دن صفیہ کا انتظار کرنا ہوگا۔ صفیہ تم اسے نہیں جانتے کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں۔ صفیہ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے میلوں دور ہوتی جارہی ہے۔ حالانکہ اس کی آسمان سے باتیں کرنے والی کوٹھی اسی شہر میں ہے۔ یہاں سے دس منٹ کا راستہ بھی نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ دن بدن لمبا ہوتا جارہا ہے اور وہ مجھ سے دور ہوتی جارہی ہے میلوں دور۔ بتا دو یار میں کیا کروں۔ اس درخواست کو کیا کروں، اس سند کو کیا کروں، اس قابلیت کو کیا کروں جو میرے کسی کام کی نہیں۔ جس سے میں ایک صفیہ کو حاصل نہیں کرسکتا۔ ایک نوکری کو حاصل نہیں کرسکتا۔ بتا دو یار میں کیا کروں ——————

بتا دو یار ——————

رات سیاہ اور تاریک ہوتی جاتی ہے اور ارشد سر جھکائے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں گھس جاتا ہے اور گلی بھی خاموش چپکے چپکے اونگھا کرتی ہے بوڑھی کی طرح!۔

لیکن یہ گلی کچھ نہیں بولتی۔ خاموش ہے!۔

گلی خاموش ہے اور ایک زمانے سے خاموش ہے۔ حالانکہ گلی ان سب کو دیکھتی ہے۔ مولانا کی لمبی سفید داڑھی کو اور ان کی کمسن بیوی کو اور ان کے ایک درجن بچوں کو جو چیتھڑے لٹکائے ہوئے ادھر ادھر بکھر رہے ہیں، درجن کی

مائیں اپنے لالوں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ گلی دیکھتی ہے اُس بوڑھی کو جو دن بھر دیوانی کی طرح ٹہلتی رہتی ہے۔ اس اماں کو جس کے جوان بیٹے کو ذبح کیا گیا، محض اس لئے کہ وہ ہندو تھا۔ گلی دیکھتی ہے اُس رکشا کو جو رات کی تاریکی میں ڈوب کر دن کے اُجالے میں نکلتا ہے۔ اُس لڑکی کو جس کے آنکھوں کی چمک، اور جس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور جس کے گالوں کی سُرخی کو ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا۔ گلی دیکھتی ہے اُس جوان عورت کو جو آسمان کو گھورا کرتی ہے، اور جس کے گلے کی مالا ٹوٹ چکی اور جس کے حسین ہاتھ ننگے ہیں۔ گلی دیکھتی ہے اُس شخص کو جسے مجبوراً رازق، رحیم، کریم بننا پڑا۔ گلی دیکھتی ہے اُس توند کو جو دن بدن بڑھ رہی ہے: ایک حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح۔ گلی دیکھتی ہے اُس نوجوان کو جو دن بھر سڑکوں، فٹ پاتھوں پر پھرنے کے بعد رات میں آ گلتا ہے۔ اداس اور خاموش گلی دیکھتی ہے!۔

گلی دیکھتی ہے اور ایک زمانہ سے دیکھتی ہوئی آئی ہے۔ اِن کی باتوں کو سنتی اور سمجھتی ہے، لیکن کچھ نہیں بولتی۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ایک ہی چال ہے، جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ سیدھی بالکل سیدھی، ڈھلوان نام کو نہیں۔ اور یہ سنگلاخ چٹانوں سے بنائی گئی ہے۔ سیدھی اور سخت!۔

آبادی سے دور، شہر کے اس کونے میں یہ ہے ایک گلی!۔

جائزے

ترقی پسند ادب

اس بار

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

ضیاء عظیم آبادی

ترقی پسند ادب

کسی دور کے ادب یا ادیب پر تنقید کرنے سے پہلے ایک سلجھے ہوئے نقاد کا فرض ہے کہ اُس کے ماضی کا بغور مطالعہ کرے اس لئے کہ حال کا محل ماضی ہی کے کھنڈرات پر تعمیر کیا جاتا ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر پرانے نقش و نگار نئے رنگ ڈھنگ میں ضرور دعوتِ نظارہ دیتے رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وسعتِ نظر نہ ہونے کے باعث ہمیں ہر منظر جدید تہذیب و تمدن کا شاہکار محسوس ہو اور گزرے ہوئے دَور کو ہم ناقص و نامکمل تصور کرنے لگیں۔ مگر یہ ہمارا ایک طرفہ فیصلہ ہوگا اور کوئی صحیح الدماغ انسان ہماری رائے کو وقعت دینے کے لئے آمادہ نہ نظر آئیگا۔

دور کیوں جائیے۔ سامنے ہی کی مثال وکٹوریہ میموریل ہال کو لے لیجئے۔ اگر کسی ایسے نوجوان کو دکھایا جائے جس نے سیر و سیاحت نہیں کی ہے اور تاریخ ہند سے بھی واقف نہیں ہے تو آپ یقین جانیئے وہ اس کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد اپنے بزرگوں کو بالکل جاہل تصور کریگا۔ اور دورِ موجودہ کے لوگوں کو صدر میں جگہ دینے کے لئے آمادہ ہو جائیگا۔ لیکن اگر وہ شخص دیکھے جو تاج محل، لال قلعہ، اور فتح پور سیکری کو دیکھ چکا ہے تو بلا شبہ کہدیگا: قدیم فن معماری کی تقلید ہے اور جدید فنکاروں نے ضرورتِ وقت کے پیش نظر بڑی کامیاب ردّ و بدل کی ہے، اسی کا نام ارتقاء ہے جو فن معماری کی طرح زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے اور اسی لئے ہم اس تحریک کو ترقی پسند کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور جو لوگ بحرِ منجمد کی طرح ایک مرکز پر قائم ہیں یا دورِ گذشتہ کی یاد تازہ کرکے مسرت حاصل کرتے ہیں انھیں کو ہم رجعت پسند کا لقب دیتے ہیں۔

ترقی پسند گروہ کسی خاص شعبے کے لئے مخصوص نہیں ہے اور نہ یہ کسی خاص زمانہ کی پیداوار ہے بلکہ اس کا تعلق زندگی سے ہے، جیسے جیسے یہ ترقی کی طرف مائل ہوتی گئی ہے، ویسے ویسے ترقی پسند تحریک پروان چڑھتی گئی ہے۔ ترقی پسندی دراصل زندگی کی ضرورت کے ماتحت عالمِ وجود میں آئی اور جس وقت حیات مستعار نے جو مانگا وہ اس نے پیش کیا۔ اس کا کام غمزدوں کو پُرسکون و مطمئن بنانا ہے اور کائنات کی تمام چیزوں کو ہر انسان میں برابر تقسیم کرنا ہے۔ یہ کسی خاص حلقے کو مراعات دینے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ بلکہ فطرت کی جملہ تخلیق پر لوگوں کا یکساں حق سمجھتی ہے۔ اسی لئے شہنشاہیت اور سرمایہ داریت سے اس کو مستقل بیر ہے اور یہ ان کا نام تک صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہے۔ یہ مادیت کو روحانیت کی طفل تسلیاں دیکر جمود پسند بنانے کی قائل نہیں ہے بلکہ اسے انسان کی ہر خواہش کا احترام ہے، اور اسے پورا کرنے میں معین و مددگار ثابت ہونا چاہتی ہے اسی لئے اس کا ہر پہلو ہماری زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور ہمیں اپنا مکمل عکس اس میں نظر آتا ہے۔

ادب جو آدم کی تخلیق کے ساتھ عالمِ وجود میں آیا ہے اس میں یہ عنصر ابتدا سے موجود ہے اور ارتقاء انسانی کے دوش بدوش اپنے ترقی پسندانہ محرکات کو مسلسل و بتدریج بلند کرتا رہتا ہے۔ ایام جاہلیت کی معلومات شاہد ہے کہ بہائم صفت لوگ جب سیر و شکار سے شام کو واپس آتے تھے تو اپنے اپنے غاروں میں الاؤ جلاتے تھے اور سارا قبیلہ اردگرد بیٹھتا تھا، پھر ان میں کا سب سے معمر انسان کھڑا ہوتا تھا اور اپنے آباؤ اجداد کی بہادری کی داستانیں سنا کر موجودہ گروہ کو اس سے آگے بڑھنے کی تبلیغ کرتا تھا۔ ہندو ازم نے اسی دستور قدیمہ پر عمل کیا اور ہندوستان کی عظیم الشان جنگ "مہابھارت" میں سری کرشن نے ارجن کو بالکل اسی عنوان سے درس دیا جسے "گیتا" کے نام سے مدوّن کیا گیا۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی

اس کی عادی تھیں اور اُسی لڑائی میں ارجن کے بیٹے ابھیمنیو کو اُس کی ماں سبھدرا دیوی نے بزرگوں کی کہانیاں سنا سنا کر کچھ اس غیر محسوس طور پر ارتقا کا پیام دیا کہ اٹھارہ سال کے نوجوان کا خون جوش میں آگیا اور آزمودہ کار دشمنوں کے مقابلے میں تنہا نکل گیا۔ ہندوستان کی طرح عرب کا دورِ جاہلیت بھی اسی اصول پر کاربند تھا اور بکثرت قصائد اب تک اس جذبے کے حامل موجود ہیں۔ اسلام نے اس رنگ میں تبدیلی کی اور ترقی پسند مذہب ہونے کے باعث اس نے محض جنگ و جدل تک ارتقا کو محدود نہ رکھا بلکہ "نسبی فرق اور مالی اختلاف" وغیرہ کے مٹانے پر بھی زور دیا، چنانچہ اس دور کے اربابِ قلم اس سے متاثر ہو کر زندگی کی ترقی کے ساتھ خود بھی چند گام آگے بڑھ گئے۔ ایران کی پُرسکون فضا نے ذہنِ انسانی کو زیادہ غور و فکر کی طرف مائل کیا۔ فلسفہ کی موشگافیاں شروع ہو گئیں، عبد و معبود کے رشتے کو علم کی روشنی میں دیکھنے کی طلب پیدا ہوئی، اخلاقیات کی قدروں کو سمجھنے کا حوصلہ بڑھا، تخلیقِ عالم کے وجوہ پر سوچا جانے لگا۔ یہیں سے تصوف کا وقار بڑھا اور انسان کچھ اور بلند ہو گیا۔ ادب بھی ترقی پذیر ہوا۔ حافظ، خیام، جامی، عرفی، نظیری وغیرہ نے روحِ مذہب، اخلاق کو قرار دیکر نوعِ آدم کے قلوب میں غیر معمولی وسعت پیدا کر دی اور یہ اس وقت کے اعتبار سے کامیاب ترقی پسندانہ اقدام تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی فارسی شعر و ادب بھی آیا، یہاں کے باشندوں نے جب ملکی سیاست میں دخیل ہونے کے لئے آقا کی زبان سیکھی اور عجمی جواہر پاروں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تو انھیں کچھ اجنبیت نہ محسوس ہوئی ویدانتک فلسفہ تو اُن پر مسلط تھا ہی۔ ان کے صوفی مشرب شعرا کے اشعار تصوف کا پرچار کر ہی چکے تھے۔ وہی باتیں یہاں بھی ملیں غیر معمولی ارتباط بڑھ گیا اور ایران و ہندوستان کچھ ایسا خلط ملط ہوا کہ لاشعوری طور پر ایک کی تہذیب دوسرے پر حاوی ہو گئی اور زبان اُردو کے وجود میں آنے کے بعد اگر ہندو شعرا نے گل و بلبل کا ذکر کرنا شروع کیا تو امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے ٹونے، سہاگ اور شادیانے گیت ہندوستانی زبان میں کہکر حد سے زیادہ دلچسپی و محبت کا ثبوت پیش کیا۔ اس سے دو قوموں کے میل ملاپ کو بہت فائدہ پہنچا اور مغلوں کے زمانے تک ہندوستان کو اپنی حکومت محسوس ہوتی رہی۔ لیکن طبقاتی فرق اس وقت بھی موجود تھا اور بعض حساس لوگ متاثر ہو کر اسے پیش کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ نظیر اکبر آبادی کا نام سب سے اول لئے جانے کے قابل ہے۔ اُن پر یہ جذبہ شدت سے طاری تھا۔ اُن کی شاعری صرف نچلے طبقے کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ غالب بھی باوجود صوفی مشرب ہونے کے بیحد حساس واقع ہوئے تھے اور اپنی مفلوک الحالی کے سبب سے جب دل و دماغ کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتے تھے تو بیتاب ہو کر متوسط درجہ کی کشمکش بیان کر ہی بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اپنی طبیعت کے برعکس جب بادشاہ کی مصاحبت قبول کرنی پڑی اور جا بیجا تعریف و توصیف کی ضرورت پیش آئی تو اپنی خودداری اور آزادی کا ماتم ان الفاظ میں کرنے لگے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　⁂　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اگر ترقی پسندی کا معیار محض غربا کے جذبات اور نچلے طبقے کے واردات تک محدود کر لیا جائے تو بھی یہ لوگ سو فیصدی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں ان کے دور کا ترقی پسند فنکار نہ کہیں، بلکہ انشا، میر اور راسخ عظیم آبادی کا بھی اضافہ کرنا ہو گا، چونکہ غربت اور تنگدستی کا شکوہ ان کے یہاں بھی بکثرت ہے، بلکہ انشا کو تو اسی تاثر نے مخبوط الحواس بنا دیا تھا۔ اور آگے بڑھئے تو آزاد و حالی اس راہ میں گل افشانی کرتے نظر آتے ہیں اور قدم قدم پر ترقی پسند رجحانات کا ثبوت دیتے ہوئے ملتے ہیں۔ انھیں حضرات نے قدیم طرحی مشاعرے کے بُت کو توڑا اور کرنل ہالرائڈ کی تجویز کے ماتحت لاہور میں ایسے جلسوں کی بنیاد رکھی جن میں بجائے غزلوں کے نظمیں پڑھی جایا کرتی تھیں۔ عنوانات پہلے سے تقسیم کر دیئے جاتے تھے اور ان کے ماتحت کہنے والے اپنے جوہر دکھلاتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے انھیں صحبتوں کے لئے "برکھا رُت"

"نشاط امید" - "مناظرہ" - "رحم و انصاف" اور "حبِ وطن" کے عنوانات پر اشعار کہے - آخرالذکر تخلیق نے قوم کے مردہ جذبات میں تلاطم برپا کر دیا، لیکن سیاسی قوت تو تھی نہیں لہٰذا مقابلہ کا حوصلہ پیدا نہ ہو سکا - ہاں اس احساس نے قومی نظمیں کہنے کی طرف نوجوانوں کو کثرت سے متوجہ کر دیا اور آج آپ ہندوستان میں جو کچھ انقلابی شاعری دیکھ رہے ہیں اس کے بانی و مبانی حالیؔ ہیں۔ نظم معرا کی بھی یہی صورت ہے - سرسید کی تحریک جب پروان چڑھی اور مسلمانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی پائیداری محسوس کر کے انگریزی زبان کی طرف مخاطبت شروع کی تو اپنے ادب میں وسعت پیدا کرنے کے لئے تراجم کی رسم کو عام کیا اور سب سے پہلے اس رنگ کی نظم مشہور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شررؔ نے فرمائی - جمود پسند لوگوں میں ہیجان برپا ہوا - اخبار "اودھ پنچ" نے مذاق اڑانا شروع کیا، مگر اصول ارتقار کے ماتحت جب انسان بڑھ چکا تھا تو پھر اس کے ادب کو کیسے پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا - باوجود مخالفت کے اس قسم کی شاعری کا رواج ہوا - اور اسمٰعیل میرٹھی نے تو قابل قدر نظمیں کہیں - اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مغرب کا تحفہ نہیں تھا جس سے رجعت پسند حلقہ بیزاری کا اعلان کر رہا تھا - بغیر ردیف و قوافی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے مرتب کرنا خاص ہندوستان کی چیز ہے - علم موسیقی میں دھرپت ہولی خیال پٹہ وغیرہ کی بندش بالکل یہی ہوتی ہے - اہلیہ بائی اور میرا بائی کے اکثر گیتوں کی بھی یہی وضع ہے - مگر غیظ و غضب میں اس حقیقت کی طرف خیال بھی نہ گیا اور آزاد شاعری کو مستقل انگریزوں کی ملکیت سمجھ لیا گیا - لیکن اس سمجھنے سمجھانے سے ہوتا کیا ہے - وقت آگے بڑھ رہا تھا - زندگی طراری بھر رہی تھی - ادب اس دوڑ میں برابر کا شریک تھا اور ترقی پسند تحریک عام ہوتی جا رہی تھی - شعر و شاعری نے جب زبان اردو میں وسعت پیدا کر دی اور لوگوں کو نثر کی طرف مخاطب ہونا پڑا تو یہی عنصر اس میں بھی آیا - فرسودہ داستانیں بھی اپنے دور کے اعتبار سے آگے بڑھنے کی خواہاں تھیں - تخیلی کردار بھی حسنِ اخلاق سنوارنے کے طلبگار تھے - پھر وقت نے کچھ اور ترقی پسند فنکار پیدا کئے - ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شررؔ کسی نے گھریلو زندگی پیش کی، کسی نے تاریخی واقعات سنائے، کسی نے زبان دانی کا درس دیا، کسی نے طبقۂ نسواں کی اصلاح چاہی - الغرض سب کا اقدام ترقی پسندانہ تھا اور اپنے دور کے لحاظ سے کامیاب و کامران -

جنگ عظیم کے بعد ملک میں سیاسی بیداری پھیلی - لوگوں نے حکومت سے نفرت محسوس کی - سرمایہ داری کے عروج کو دیکھا اور غریب کسانوں و مزدوروں کی کشمکش کا اندازہ ہوا - ادب کا رخ مڑا - مسٹر گاندھی نے منشی پریم چند کو اپنا ادبی ایڈیشن منتخب کیا ہندوستان کو ٹالسٹائی قسم کے مصنف کی ضرورت تو تھی ہی - ان کے رشحاتِ قلم سر آنکھوں پر اٹھائے جانے لگے - فنی حیثیت سے ان کا کمال آخری حدوں پر پہنچا ہوا تھا - اسی لئے کہیں بھی ان سے پمفلٹ نگاری سرزد نہ ہوئی - اور جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں غیر معمولی ادبیت بھر دی - عظیم بیگ چغتائی متوسط طبقے کے سدھارنے کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کے مذاح میں ایک دنیا پوشیدہ ہونے لگی - زندگی کچھ اور آگے بڑھی - ان لوگوں کے پیغام گھٹے گھٹے محسوس ہوئے اور نوجوانوں نے چاہا کہ کھری کھری باتیں کہیں، لہٰذا "انگارے" کی تخلیق ہوئی جس میں ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احمد علی اور سجاد ظہیر نے شرکت کی تھی - مگر اس کتاب کو حکومت نے ضبط کر لیا - اور پریم چند کی قیادت میں ایک ایسی انجمن بنائی گئی جس میں ادب کو زندہ اور صحت مند ادب پیش کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا - چنانچہ گذشتہ دس سال کے اندر اردو ادب نے غیر معمولی ترقی حاصل کی اور ایسے ایسے کامیاب و حساس ادیب و شاعر پیدا کئے جن کی دوربین اور دوررس نگاہیں زندگی کے رگ و ریشہ کا تجزیہ کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں - ان سب کا مقصد حال کو بہتر بنانا ہے - لیکن تاثرات مختلف ہیں - کوئی روٹی سے متاثر ہے - کسی کو جنس کا مسئلہ بیچین کئے ہوئے ہے، کسی کو سیاست سے غیر معمولی لگاؤ ہے، کوئی رسم و رواج کا مخالف ہے - اگر آپ یہ چاہیں کہ ان میں یہ فرق باقی نہ رہے اور سب کو ایک ہی مرکز خیال پر جمع کر دیا جائے مثلاً روٹی کے مسئلہ پر

تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ اوّل تو کوئی سلجھا ہُوا فنکار اپنے محسوسات کے خلاف لکھنے پر آمادہ ہی نہ ہوگا اور اگر ہو بھی جائیگا تو اپنی تخلیق میں زندگی نہ پیدا کر سکیگا، اس کا فن جسدِ بے روح ثابت ہوگا۔ سوچنے اور کہنے کی آزادی ہی کا دوسرا نام ترقی پسندی ہے۔ یہ انسان کو محدود نہیں کر سکتی ـــــ ایک شخص فطرتاً مرنجان مرنج واقع ہُوا ہے، اپنے افلاس کو محسوس نہیں کرتا، فاقوں میں مسکراتا ہے۔ آپ اس سے کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ بھوکوں کے جذبات کا احساس کریگا اور ان کی مصوّری کرنے پر تیار ہو جائیگا۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ اصولِ ارتقاء زندگی کے ہر شعبے میں جاری ہے اسی لئے ادب کی ترقی پسند تحریک بھی تمام گردوپیش کو لپیٹے ہوئے ہے اور آپ اس کو محدود کر کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ زندگی کی مکمل تشریح اگر ادب کے ذریعہ ممکن ہے تو پھر آپ کو وسعتِ نظری سے کام لینا ہوگا اور ہر صاحبِ فکر کو یہ اختیار دینا ہوگا کہ وہ اپنے اپنے طور پر ماحول آفرینی کرے۔ ہمارا مقصد موجودہ نظام میں مکمل انقلاب ہے۔ ہمیں ہر پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے اور ترقی پسند ادب کا مفہوم بھی یہی ہے۔ مانا کہ یہ بحرانی دور ہے لیکن اسی وقت ایک تعمیری پروگرام مرتب ہو جانا چاہئے اور ذہنی بیداری کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارا قدم کس طور پر اُٹھے۔ بغاوت تو بہترین چیز ہے اور قدامت سے کنارہ کشی بھی لازمی ہے۔ لیکن ایک معیار تو مقرر ہونا چاہئے کہ کن چیزوں سے بغاوت کی جا سکتی ہے اور کرنا مناسب ہے، محض اسی اصول کو قائم نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ سینکڑوں نااہل لوگ ادیب بنکر ترقی پسند تحریک کو غیر معمولی حد تک رسوا کر چکے ہیں اور اپنے افکارِ پریشاں سے مزید کوشش میں مصروف ہیں۔ اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ جو ناقص عناصر ہیں وہ خود بخود فضا میں تحلیل ہو جائیں گے اور تندرست و صحت مند اقدار زندہ رہ جائیں گے تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ صرف دل بہلانے کی باتیں ہیں، جس عمارت کی بنیاد کمزور ستونوں پر قائم ہوتی ہے، اس میں کسی نہ کسی وقت نقص پیدا ہو کر ہی رہتا ہے، اور عمرِ طبعی تک پہنچنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ آپ کو تو ایسے ادب کی تخلیق لازم ہے جو زندگی کا مجموعی صورت سے مصوّر ہو اور فنّی حیثیت سے بھی کم از کم اس قابل ضرور ہو کہ نوجوانِ مستقبل بالکل گمراہ نہ ہو جائیں اور ادب اور پروپگنڈے میں کوئی امتیاز نہ محسوس کر سکیں۔

ہمارے نئے ادب کے لئے یہ وقت بیحد غور و فکر کا ہے، رجعت پسندوں کی مخالفت دم توڑ چکی ہے۔ قدامت اپنے حملوں کی ناکامی سے شرمندہ ہو کر منہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں "ادب برائے زندگی" کے پرستار پیدا ہو چکے ہیں، اور نئے نئے جرائد و رسائل نکل رہے ہیں، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ان کے سامنے ترقی پسند تحریک کو واضح اور ہمہ گیر صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ مستقبل کا مورّخ ہمارے فن پاروں کو پمفلٹ نگاری تصوّر کر کے نظر انداز کر دیگا۔ بلکہ ایک مفید اور کامیاب مقصد کو بھی شدید نقصان پہنچیگا۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری کوششیں محض ہنگامی ہیں اور آنے والے دور کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کا ہر قدم آنے والے زمانہ کے لئے ایک سنگِ میل ہے جس کی آب و تاب میں جدیداہیں نظر آئیں گی اور کاروانِ ارتقاء منزل بہ منزل بڑھتا جائیگا۔ جس قدر جامع و مانع نقش ہم چھوڑیں گے اسی قدر رفیع و اعلیٰ مستقبل تعمیر ہوگا۔

سیاست کی اہمیت مسلّم۔ لیکن بقول ممتاز شیریں "اردو میں کسی نے سیاست وغیرہ پر افسانے لکھے بھی ہیں تو ایسے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس موضوع پر لکھنے کی خاطر افسانہ لکھا گیا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ یہ کہا جاتا ہے۔ ادب میں سیاست دخل، اسے فن نہیں، پروپگنڈا بنا دیتا ہے"۔ دیکھا آپ نے ایک وسیع النظر نقاد نے ہمارے فن پاروں کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔ یہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو محدود کرنے کا نتیجہ ہے، ہر وہ شخص جو اپنے کو نئے فنکاروں میں شامل کرنا چاہتا ہے بغیر تاثرات کے زبردستی سیاسی رجحانات کی ترجمانی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ بغیر ... محض فیشن کے طور پر کسی موضوع پر قلم اُٹھانے کی زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ انھیں اپنے دماغوں سے یہ تخیل نکال دینا چاہئے

ترقی پسند ادب کسی خاص سیاسی جماعت کے نظریوں کو عام کرنیکا ذریعہ ہے۔ وہ ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔ اس کا کام تو زندگی کی اصلاح، ترقی اور مصوری ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان دنوں ہماری عمر رواں سرمایہ داریت و ملوکیت کی چکی میں بری طرح پس رہی ہے۔ ہر طرف بھوک اور فاقہ کی گرم بازاری ہے، قحط کے آثار نمودار ہیں، خود غرضی بام عروج پر پہنچ چکی ہے۔ انسانیت پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ انفرادیت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سماج کی پابندیاں، قانون کی سختیاں اور قدیم رسم و رواج کی زنجیریں انسان کو اپنے شکنجوں میں کسے ہوئے ہیں —— خود ساختہ تعصب مذہب کے نام پر ہندستان کو خانہ جنگی کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ سوسائٹی کی زیادتیاں ہر حساس فرد کو جھنجھوڑ چکی ہیں۔ فنکار بھی اسی کے ممبر ہیں۔ اپنی تخلیق کی بنیاد اپنے ماحول کے ماتحت تعمیر کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کا فن بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے۔ پرانی دیواریں گر رہی ہیں اور ایک مشترکہ مساویانہ نظام کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی سیاسی جذبہ نہیں ہے۔ محض ماحول کے تاثرات کارفرما ہیں۔ جس کا جس قسم کی سوسائٹی سے تعلق ہے اس کا اسی قسم کا مرقع ہے۔ کسی کے یہاں مل کے دھوئیں، مزدوروں کی چیخیں۔ سرمایہ داروں کے مظالم شدت سے نمایاں ہیں۔ کوئی دیہات کے جفاکش کسانوں کا مصور ہے کسی کو سماج کے ٹھکرائے ہوئے آوارہ گردوں، اوباشوں اور طوائفوں سے ہمدردی ہے۔ کسی کی دوربین دور رس نگاہیں مغرب زدہ مرد عورت کے اعمال و اطوار کا تجزیہ کر رہی ہیں۔ کوئی جنسیاتی کشمکش بیان کر رہا ہے۔ کسی نے نفسیاتی حقائق کو عوام الناس تک پہنچانا ضروری سمجھا ہے۔ کوئی قدیم معاشرت کے نقائص پیش کر کے ملک کو اجتناب کی دعوت دے رہا ہے کسی نے متوسط گھروں کی خامیوں کو اجاگر کرنے کا بار اپنے سر لے لیا ہے۔ کوئی فطری خواہشات کی نقاب کشائی میں مصروف ہے —— الغرض کسی کا فن بغیر مقصد نہیں ہے سب مکمل اور پائدار انقلاب کے طلبگار ہیں۔ محض تفریح حاصل کرنا مدنظر نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض جنسی و نفسیاتی فن پاروں میں تلذذ ملتا ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ یہ "ادب برائے زندگی ہے یا ترقی پسندانہ اقدام کے خلاف ہے" "ادب برائے زندگی" کے معنی ہی یہ ہیں کہ حیات مستعار کا ہر رخ اس میں پایا جائے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ ایک ایسی تحریک جو زندگی کے لئے ہو، وہ کسی خاص نقطہ پر کیسے ٹھہر سکتی ہے۔ انسانیت کی معراج محض روٹی ہی تو نہیں ہے۔ اور بھی فطری ضروریات ہیں، ان سے چشم پوشی کر کے کیسے کوئی تحریک جامعیت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ خصوصاً جنس کا مسئلہ تو زندگی کا اہم ترین جز ہے ——۔ ہمارے مورث اعلیٰ حضرت آدم کو روٹی سے پہلے عورت کی خواہش ہوئی تھی، اور "حوا" کے وجود میں آنے کے بعد گندم خوری کا جرم ان سے سرزد ہوا تھا —— ہمارا جنسیات سے متاثر ہونا تو فطری چیز ہے۔ اگر اسے ترقی پسندی کی پیشانی پر بدنما دھبہ تصور کیا جائیگا تو نئے ادب کا ایک بڑا فنی حصہ ختم ہو کے رہ جائیگا۔ اور زندگی کا نمایاں پہلو تاریکی میں پوشیدہ ہو جائے گا، جس کی بنا پر موجودہ ادب اجتماعی حیثیت سے حیات انسانی کا ترجمان نہ کہلا سکیگا، بلکہ صرف پیٹ کی فریاد بن کر رہ جائیگا۔ جس سے ترقی پسندی کی وضاحت ناممکن ہو جائے گی۔ یہ جامع و مانع لفظ ہمارے چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔ صرف روٹی ہی کی بھوک کا ازالہ اس کا نصب العین نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مجموعی صورت سے زندگی میں ارتقا اس کا صحیح مفہوم ہے

ایک زمانہ تھا کہ رجعت پسندوں کی طرف سے جنسی ادب کی شدید مخالفت کی جا رہی تھی تو تمام ترقی پسند مصنفین متانت اور انداز سے تشفی بخش جوابات دے رہے تھے۔ مگر اب چند سیاسی کارکنان نے اپنے مقصد کو عام کرنے کے لئے مخالفین کو موافق بنانے کی کوشش کی ہے اور انھیں کو ہم نوا بنا کر نفسیاتی تجزیوں کو ترقی پسندی سے خارج کرنا چاہا ہے میرے خیال میں نئے لوگوں کے لئے یہ اعتراف شکست سخت توہین آمیز ہے۔ کسی وقت انھیں اس مغالطہ میں مبتلا

ہونا چاہیے کہ جنس پر لکھنے والے ذہنی تعیش کے طالب ہیں یا زندگی سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کا تمام تر تعلق حیات انسانی سے ہوتا ہے۔ یہ مفلوکوں کی بستی سے بھاگ کر پناہ لینے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن انسان ہیں اور جذبات انسانی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنے کے لئے فطری طور پر مجبور ہیں۔ آپ جن کی ترجمانی فرماتے ہیں اُن غرباء کو ہی لے لیجئے کیا ہر وقت وہ روٹی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں؟ یقین جانئے وہ تو اس تفکر سے بھاگ کر دلچسپ ماحول میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے اپنی ہستی کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ اور اس کا بیّن ثبوت ان کی بکثرت اولاد سے ملتا ہے۔ میں اسے اُن کی بے حسی نہیں سمجھتا بلکہ زندہ رہنے کے لئے اسے فطری مشاغل تصوّر کرتا ہوں۔ آخر انسان ہی تو ہیں کہاں تک پیٹ اور روٹی کے مسئلہ پر سوچے جائیں۔ کچھ دیر تو ضرور بے فکری کی زندگی بسر کرنے کے طلبگار ہوں گے۔ پھر آپ اُن ادیبوں کو کیوں موردِ الزام سمجھیں جو روٹی کی بھوک سے علیحدہ ہو کر جنسی بھوک کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر آپ اسے قدیم ادب کی بدلی ہوئی صورت قرار دیکر لائق توجہ نہیں سمجھتے تو غربت اور افلاس کا رونا دونا کوئی نئی بات ہے۔ اسے بھی نظر انداز فرما دیجئے۔ ترقی و جدّت کا یہ مفہوم تو نہیں ہو سکتا کہ جو باتیں پہلے ہو چکی ہیں وہ دوسرے سے اب نہ ہوں۔ اگر یہ امکانی چیز ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ لوگ کہتے۔ ہاتھوں سے کھانا کھانا بالکل قدیم رواج ہے۔ پیروں سے کھائیں گے۔ یا ٹانگوں میں پائجامہ پہننا پرانی رسم ہے۔ اب گلے میں پہنیں گے۔ اور آگے بڑھا جائے تو اللہ میاں سے یہ درخواست کرنیکی خواہش ہوگی کہ آدم سے لیکر اب تک اسی وضع قطع کے انسان پیدا ہوئے جا رہے ہیں آخر یہ کیا قدامت پرستی ہے۔

جدّت کسی حقیقت کے بدل دینے کو نہیں کہتے۔ بلکہ زمانہ کے موافق جو اس میں تغیر و تبدّل ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ مثلاً "ہمہ اوست" کا مسئلہ تصوّف کی جان ہے۔ اور تمام صوفیائے کرام کا اس پر اعتقاد ہے کہ کل کائنات ایک ہی روح کامل کی حرکت سے وجود میں آئی ہے۔ اب اسی کو یورپ کے مشہور سائنسداں سر الیور لاج یوں بیان کرتے ہیں کہ جب زمین پر کوئی پتی توڑی جاتی ہے تو آسمان پر ایک ستارہ متحرک ہو جاتا ہے۔ بات بالکل ایک ہی ہے جب روح کامل واحد ہے تو اشیاء عالم میں رابطہ لازمی ہے۔ اور ایک کے دکھ سے دوسرا یقینی متاثر ہوگا۔ لیکن آپ یقین جانئے سر الیور لاج کے ذہن میں تصوّف کا مسئلہ وحدت الوجود نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اُسے اس نے دھرایا نہیں ہے۔ بلکہ ایک محسوس کی ہوئی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اس میں اگر اسے صوفیائے کرام سے اتفاق ہو گیا ہے تو یہ اور بات ہے۔ بالکل وہی طرح اُدبا و شعرا کی تخیلات کا حال ہے۔ مان لیجئے کہ مومن خاں نے مثنوی خواب و خیال میں جنس کے مسئلہ پر بڑی بیباکی سے اشعار کہے ہیں۔ اور اتفاق سے عصمت، منٹو اور ممتاز مفتی بھی اسی موضوع پر لکھتے ہیں تو کیا آپ ان لوگوں کو قدامت کا مقلّد کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اسی طرح برسات کے موسم میں غرباء کے حال سے متاثر ہو کر مخدوم ایک نظم کہتا ہے۔ اتفاق سے نظیر اکبرآبادی کے یہاں بھی اسی طرح کی تصویر ملتی ہے۔ کیا آپ مخدوم کو رجعت پسند کہنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ انسان ابھی ارتقاء کی آخری منزلوں پر پہنچا نہیں ہے۔ جو اسکے محسوسات بالکل بدل جائیں۔ طبع بشر تو یکساں ہے اور یکساں رہیگی۔ تعلیم، تربیت، ماحول اور مذہب وغیرہ کے اثرات سوچنے سمجھنے کے انداز میں اختلاف پیدا کر دیں گے۔ اور ہم احساسات کی مکمل ترجمانی پلاٹ کی یکسانیت اور زندگی کی مصوری دیکھ کر رائے قائم کریں گے۔ اگر اس میں اجتماعیت اور ارتقائی عناصر ہونگے اور پھر دوراں کی مجموعی عکاسی ہیگی تو ہم اسکو ترقی پسند ادب کہیں گے ورنہ نہیں صحیح ترقی پسند ادب تو یہی ہو جو جاندار دماغ مصتور ہونگے ساتھ ارتقاء کی مدارج طے کرانے میں انسان کا سہارا بنے۔

ادارہ

اِس بار

(بغرض تبصرہ حسب ذیل رسائل وکتب موصول ہوئی ہیں!)

کہانی (سہ ماہی سلسلہ)

خالص افسانوی ادب کا سہ ماہی سلسلہ "کہانی" کے زیر عنوان باہتمام موہن لال شیلا جھریا سے شائع ہوا ہے جس کے مرتب سہیل عظیم آبادی ہیں سہیل بحیثیت افسانہ نگار کافی مشہور ہیں اور اردو ادب میں ایک مستقل حیثیت کے مالک — لہذا "کہانی" کو اگر سہیل کے مقام سے پرکھا جائے تو ہم کچھ کہنے سے نہ کہنا اچھا سمجھیں گے — تاہم مقصد کے لحاظ سے یہ کوشش یقیناً قابل پذیرائی ہے — لکھنے والوں میں نہ صرف بعض اچھے نام نظر آتے ہیں بلکہ بعض اچھی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس انتخاب میں جو خامیاں رہ گئی ہیں یا جن لکھنے والوں کو کسی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اُس کے متعلق ہمارا توجہ دلانا اس لئے غیر ضروری ہے کہ سہیل عظیم آبادی افسانوی ادب کے ارتقاء سے بخوبی واقف ہیں۔ "کہانی" جیسا کہ اعلانات سے ظاہر ہے سہ ماہی سلسلہ ہے جو مدّت معینہ کی بہترین افسانوں پر مشتمل ہو گی۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس سلسلہ کو زیادہ وسیع اور جامع بنایا جائے۔ افسانوں کے انتخاب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو تین ماہ میں شائع ہونیوالے تمام بلند پایہ رسالوں کے بہترین افسانے باجازت مصنفین شریک "کہانی" کئے جائیں۔ یا پھر بہترین لکھنے والوں سے اُن کی بہترین کہانیاں حاصل کی جا کر شامل انتخاب کی جائیں — بہر حال طریق انتخاب جو بھی ہو، زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی ہونا چاہئے کہ "کہانی" کا ہر نمبر ہر جہت سے مکمل اور بے عیب ہو تاکہ ہندوستان کا افسانوی ادب اپنی مستقل حیثیت حاصل کر سکے۔ کتابت وطباعت غنیمت۔ صفحات ۲۰۲۔ قیمت ۸/۲ (دو روپیہ آٹھ آنے)

ملنے کا پتہ :- دفتر کہانی۔ جھریا (بہار)۔

شاہکار (بہار نمبر)

کافی انتظار کے بعد "شاہکار کا بہار نمبر" ہمارے پیش نظر ہے — فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہار نمبر کی ترتیب میں جہاں غیر معروف لکھنے والوں نے حصہ لیا ہے وہاں مشہور و معروف فنکار بھی موجود ہیں۔ بہار نمبر میں سب ہی کچھ موجود ہے، مقالے۔ نظمیں۔ قطعات۔ غزلیات۔ اور افسانے اور ڈرامے — اس رنگا رنگی کے باوجود شاہکار کے سابقہ بہار نمبر کی طرح، اس بہار نمبر میں "بہاریت" برائے نام ہے — چونکہ شاہکار کا ادارہ پچھلے تین چار سال سے برابر بدلتا رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ شاہکار کے موجودہ مدیر محمد آصف سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ شاہکار کے ہر نمبر کو شاہکار بنا کر پیش کریں گے۔ بہار نمبر کے بعض مقالات، افسانے اور نظمیں کافی بلند ہیں۔ البتہ غزلیات بہت ہلکی ہیں۔ بہر حال بحیثیت مجموعی بہار نمبر کامیاب ہے۔ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۷۶۔ قیمت بہار نمبر عہ/ (دو روپیہ)

ملنے کا پتہ :- ادارۂ ادبیات جدید۔ مسلم اسٹریٹ۔ سرکلر روڈ۔ لاہور۔

آجکل (سالنامہ)

حسب روایات یکم جون ۱۹۴۷ء کو "آجکل" کا سالنامہ شائع ہوا ہے۔ جس میں جدید و قدیم لکھنے والے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ آجکل چونکہ سرکاری پرچہ ہے اور لکھنے والوں کو معاوضہ بھی پیش کرتا ہے، اس لئے بہتر سے بہتر لکھنے والوں اور بہتر سے بہتر مضامین ونثر کا فراہم کر لینا ادارۂ آجکل کے لئے جوئے شیر لانے کے مرادف نہیں — آجکل تاریخ اجراء سے آجتک اپنا خاص معیار اور خاص مقام

صرف اس لئے حاصل نہیں کرسکا کہ جہاں وہ ترقی پسندوں کو جگہ دیتا ہے وہاں رجعت پسندوں کو بھی فراموش نہیں کرتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ وقار عظیم جیسے بلند پایہ ترقی پسند ادیب کی موجودگی کے باوجود، آجکل کا "سرکاری معیار" (جدید و قدیم کی غیر فطری آمیزش) بدستور قائم ہے۔ ممکن ہے مقصد کے لحاظ سے ادارۂ آجکل اپنے کو کامیاب سمجھتا ہو مگر آج کے دورِ ارتقاء میں یہ دو رنگی بلکہ "دوعملی" پسندیدہ (اور معیاری) نہیں کہی جاسکتی —— موجودہ ترقی یافتہ ادب بہت تیزی سے آگے بڑھ چکا ہے۔ اسلئے نئی قدروں کو پرانی قدروں سے ہم آہنگ کرنا بجائے خود مضحکہ خیز ہے —— تاہم آجکل کا "سالنامہ" بحیثیت مجموعی سابقہ سالناموں سے کامیاب ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۷۶۔ قیمت سالنامہ صرف عہ (ایک روپیہ چار آنے)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر آجکل۔ پوسٹ بکس ۱۶۶، دہلی۔

ادبِ لطیف (سالنامہ)

مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کے مالکان کے باہمی نزاع نے ادبِ لطیف کے عام معیار کو کافی نقصان پہنچایا —— پچھلے دو سال سے ادبِ لطیف بجائے ترقی کے تنزل کی طرف مائل رہا —— بارے سالنامہ دیکھکر کچھ ڈھارس بندھی —— سالنامہ کو مرتب کرنے والے برکت علی چودھری، ممتاز مفتی اور فکر تونسوی ہیں۔ مضامین نظم و نثر کی ترتیب میں کافی حسن سلیقہ کا ثبوت دیا گیا ہے —— لکھنے والوں میں تقریباً وہ تمام فنکار شامل ہیں جنھوں نے جدید اردو ادب کو سنوارنے اور آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان فنکاروں کے ساتھ ساتھ نئے ابھرتے ہوئے فنکار بھی نظر آتے ہیں جن سے مستقبل کے ادب کی بہترین توقعات وابستہ ہیں۔ ادبِ لطیف کا یہ سالنامہ بحیثیت مجموعی اس سال کے شائع ہونیوالے تمام سالناموں پر بھاری ہے۔ ادارہ کی پُر خلوص کوششیں دلی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ کی طرف اگر کچھ اور توجہ دیجا سکتی تو یہ سالنامہ "ادبی معجزہ" سے کسی صورت سے کم نہ تھا —— تمام مضامین نظم و نثر زندہ، صحت مند اور ترقی یافتہ رجحانات کے حامل ہیں، جن کا مطالعہ ترقی پسند ادب سے دلچسپی اور لگاؤ رکھنے والوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔ صفحات ۲۵۶۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت سالنامہ ؎ (تین روپیے) ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اُردو، لاہور۔

سہیل۔ گیا

ماہنامہ "سہیل" کے مئی اور جون ۱۹۴۷ء کے شمارے پیش نظر ہیں۔ گیا جیسے دور افتادہ مقام سے اتنے کامیاب رسالہ کا اجراء یقیناً باعث مسرت ہے —— پرچہ کو نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کیا جارہا ہے —— لکھنے والوں میں چند ایک کو چھوڑ کر سب نئے لکھنے والے ہیں۔ مگر ان کی تخلیقات میں مستقبل کی درخشانیاں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ عارف سنہاروی سہیل کی ادارت کے فرائض انجام دیرہے ہیں۔ امید ہے کہ سہیل اُردو زبان و ادب کی بیش از بیش خدمت کریگا۔ مضامین نظم و نثر کافی معیاری ہیں۔ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۵۲۔ قیمت فی پرچہ ۶؍۔ سالانہ للعہ ششماہی عا؍

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ سہیل۔ گیا۔

خونی ہندستان

مرتب یکتا امروہوی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کے فنکاروں نے ہندستان کے فرقہ وارانہ فساد سے متاثر ہوکر یہ کتاب تصنیف کی ہے اس موضوع پر یہ کتاب شاید پہلی اور آخری ہے۔ کیونکہ جب اُس کے مضامین لکھے گئے اُس وقت خون میں ڈوبا ہوا ہندستان ایک تھا اور اب اس کے دو ٹکڑے ہوچکے ہیں۔ مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہے۔ آینوالی نسلیں اسے دیکھ کر ہندستان کے اس خونی دور کا پورا پورا اندازہ کرسکیں گی۔ جب انسان انسانیت کا متحمل نہیں رہا تھا۔

جب بھائی چارے کے مقدس رشتے ٹوٹ گئے تھے، جب بھائی بھائی کا دشمن تھا۔ یہ کتاب اس بحرانی دور کی ایک مفصل تاریخ ثابت ہوگی۔

صہبا لکھنوی، وجدی الحسینی، اسد بھوپالی، محمد علی تاج وغیرہ کی نظمیں، ابراہیم یوسف کا ڈرامہ اور سلمان الارشد، رشدی، اشتیاق عارف، انجم سلمانی، قمر جمالی، عمران الارشد وغیرہ کے افسانے اس کتاب کی زینت ہیں۔ کتابت میں چند غلطیاں نظر آتی ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھا جائیگا۔ اس مجموعہ میں جملہ فنکاروں کی تصاویر بھی شامل ہیں حسین گرد پوش، طباعت اچھی۔ کاغذ سفید۔ صفحات تقریبًا ۲۰۰ ــــ قیمت دو روپیے (عار)

ملنے کے پتے

(۱) مکتبۂ افکار، بھوپال　(۲) ــ گہوارۂ ادب، بہادر گڑھ روڈ۔ دہلی۔

سنگریزے

ادارۂ اردو ادب کلکتہ کی یہ پہلی پیشکش ہے جس میں پندرہ افسانے شامل ہیں، اس کتاب کو تین افسانہ نگاروں محمد یونس احمر، شاہ خلیل الرحمٰن اور قیصر نشاط مظفر پوری کے پانچ پانچ افسانوں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پیش لفظ افسر ماہ پوری نے تحریر کیا ہے۔ جہاں تک حسن ترتیب کا تعلق ہے یہ کوشش یقینًا کامیاب ہے۔ بیشتر افسانے ماحول کے تلخ تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ ان تین افسانہ نگاروں میں سے دو کو دنیائے ادب بخوبی جانتی ہے۔ اُن کی تخلیقات زندہ اور صحت مند نظریات کی حامل ہیں ــــ چند ایک افسانے بہت مختصر اور انشائے لطیف کی طرز کے ہیں ــــ بہر حال بحیثیت مجموعی سنگریزے اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ امید کہ ادارۂ اردو ادب تعمیری تصنیفات پیش کرکے اردو زبان و ادب کی بیش از بیش خدمت کریگا۔ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۱۷۶ ــــ قیمت مجلّد عار (دو روپیے) ملنے کا پتہ :ــ ادارۂ اردو ادب نمبر ۲۰/۱ تانتی بگان لین۔ کلکتہ۔

شہدائے اسلام

اس کتاب کے مؤلف مولانا اخلاق حسین قاسمی ناظم جمعیۃ علماء صوبۂ دہلی ہیں۔ شہدائے اسلام میں ابتداءً رسول کریم کی مثالی زندگی کے چند واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ اُس کے بعد شہدائے اسلام کے تفصیلی واقعات شہادت نہایت شُستہ اور پاکیزہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ مؤلف نے سرفروشان اسلام کے کارناموں پر نہایت محققانہ نظر ڈالی ہے ــــ کتاب اس قابل ہے کہ ہر گھر میں رہے تاکہ چھوٹے اور بڑے اسلام کے شہداء کی زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کرسکیں۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت مجلد عار (دو روپیے) ــــ

ملنے کا پتہ :ــ مکتبہ رضیہ۔ دہلی۔

تذکرۂ آخرت

حکیم ڈاکٹر سید عبدالحمید اپنی گرانقدر طبی تصنیفات کی وجہ سے دنیائے طب میں ایک ممتاز جگہ رکھتے ہیں مرج البحرین، تیر بہدف، اور طب جدید وغیرہ آپ کی وہ قیمتی کتابیں ہیں جو ایک سے زائد بار طبع ہوچکی ہیں۔ "تذکرۂ آخرت" آپ کی تازہ تالیف ہے جو تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں برزخ کا بیان دوسرے میں قیامت کے احوال اور تیسرے میں قرآن پاک اور اس کی بعض سورتوں کے فضائل و خواص اور اسمارِ حسنٰی اور دعاؤں وغیرہ کا بیان صحیح اور معتبر حدیثوں اور روایتوں سے پیش کیا گیا ہے۔ شہدائے اسلام کی طرح تذکرۂ آخرت بھی ایک اعلیٰ مذہبی کتاب ہے، جس کا مطالعہ ہر مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

انداز بیان میں نہایت سادگی اور پرکاری ہے۔ واقعات کی ترتیب میں بھی خاص تنوع پایا جاتا ہے۔ نہایت عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۱۶۰۔ حسین سرورق۔ قیمت مجلد صرف ۱۲؎

ملنے کا پتہ :ــ عتیق الرحمٰن اینڈ سنز۔ چوک بازار۔ بھوپال۔

نمائندہ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے!

فلمستان

انڈین موشن پکچرز

انڈین موشن پکچرز کا نواں سالانہ اجلاس گذشتہ ماہ بمبئی میں منعقد ہوا، سبکدوش ہونیوالے صدر مسٹر ڈیسائی نے اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فلمسازی پر فسادات کے اثر کا ذکر کیا اور کہا کہ فلمی دنیا میں ناقابل تصور حالات پیش آرہے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ سب ملکر حالات کا مقابلہ کریں۔ اس اجلاس میں نئی ایگزیکیٹو بھی بنائی گئی جس میں حسب ذیل اراکین شامل کئے گئے:- مسٹر سی، جے، ڈیسائی (صدر)۔ مسٹر کادم (نائب صدر) مسٹر ملتانی (خزانچی) مسٹر چندولال، رائے بہادر چنی لال، مسٹر سی، ڈی، ڈیسائی مسٹر بھٹ، مسٹر موڈی، مسٹر واڈیا، مسٹر پانڈے مسٹر ایس، ایف حسین، مسٹر بھوانی، مسٹر منشی، مسٹر آصف۔

انڈیا فلم کارپوریشن بھوپال

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کمپنی کے پہلے فلم کی باقاعدہ شوٹنگ وسط جولائی کو بمبئی میں شروع ہورہی ہے۔ کاسٹ کا انتخاب عمل میں آچکا ہے۔ چنانچہ سردار ملّ للوانی، مسٹر نایاب علی خاں اور مسٹر عادل بمبئی پہنچ چکے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض مسٹر عادل اور مسٹر امان اللہ خاں انجام دینگے۔ پہلے فلم کو کامیاب بنانے کی زبردست کوشش کیجارہی ہے۔ نغمہ نگاروں میں صہبا لکھنوی اور نخشب جارچوی کا نام لیا جارہا ہے۔

سنٹرل انڈیا تھیٹرز

اس کا ایک فلمی ادارہ مہو چھاؤنی میں قائم ہوا ہے۔ اس ادارہ کے روح رواں مسٹر نندلال جین ایک تاریخی ڈرامہ فلمانے کا ارادہ کررہے ہیں۔

شیخ اپنے اصلی مقام پر

بیگم پارہ اولین بار خانہ بدوش، دوشیزہ "شہناز" کے لباس میں وہاب پروڈکشن کے پہلے فلم میں پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہورہی ہے "شہناز" کی کہانی شیلے کی ایک مشہور نظم سے ماخوذ ہے۔ جس میں مسٹر شیخ نے فلسفۂ محبت کی مکمل شرح کی ہے۔ ہدایت موسیقی امیر بائی کرناٹکی انجام دے رہی ہیں۔ مکالمے حضرت رجن لکھنوی گانے حضرت اختر پیلی بھیتی، حضرت عامر عثمانی کے رہین منت ہیں۔ اداکاروں میں شوخ اداکارہ بیگم پارہ، الطاف نہال۔ شانتا پٹیل۔ مصطفیٰ۔ پی، ڈی لال۔ شمع گلنار، عصمت سلطانہ اور کیرکٹر ایکٹر و ڈائرکٹر مسٹر شیخ جیسے اداکار اپنی فنکارانہ اداکاری کے جوہر دکھانے میں مصروف ہیں امید ہے کہ "شہناز" سال رواں کی بہترین نغمہ بار تصویر ثابت ہوگی۔

امریکی فلموں کے لئے مارکٹ

امریکن موشن پکچرز نے اطلاع دی ہے کہ یورپ اور ایشیا کے تقریباً ۱۰ ممالک میں امریکی فلموں کے لئے مارکٹ از سر نو کھل گئے ہیں جو جنگ کی وجہ سے بند ہوگئے تھے چیکوسلاویکیا اور پولینڈ میں مانوپلی حاصل کرلی گئی ہے جزائر شرق الہند رومانیہ، ہنگری، جاپان، کوریا اور آسٹریا میں بھی اجازت حاصل کرلی گئی ہے۔ جرمنی میں فلموں کی تقسیم کے لئے اجازت حاصل کی جارہی ہے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ سیاسی حالات کی بناء پر بلغاریہ۔ یوگوسلاویہ۔ اور روس میں امریکی فلم ممنوع تھے لیکن اب ان ممالک میں بھی امریکی فلموں کی تقسیم کے انتظامات بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچنے والے ہیں۔

"ہری مندر"

پروڈیوسر ایس، بی ڈیسائی نے "اوجانے والے" مکمل کرلی ہے جس کے خاص اداکار گیتا ڈیسائی، ترلوک کپور، حسنہ، پانڈے، مہر سلطانہ اور اُلٹکا نت ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اب "ہری مندر" کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں جس میں [illegible]